تدبّرِ قرآن

۵۵

الرّحمٰن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱۔ سورہ کا مزاج، عمود اور سابق سورہ سے تعلق

اس سورہ کو بعض لوگوں نے مدنی قرار دیا ہے لیکن پوری سورہ کا مدنی ہونا تو الگ رہا اس کی ایک آیت بھی مدنی نہیں معلوم ہوتی۔ پوری سورہ بالکل ہم آہنگ و ہم رنگ ہے اور پڑھنے والا صاف محسوس کرتا ہے کہ یہ بیک دفعہ نازل ہوئی ہے۔

اپنے مزاج اور مطالب کے اعتبار سے یہ سورتوں کے اس زمرے سے تعلق رکھتی ہے جو مکی زندگی کے اس دور میں نازل ہوئی ہیں جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کے جوش میں مخالفین اس مطالبہ پر اڑ گئے ہیں کہ جب تک ان کو کوئی نشانیِ عذاب نہ دکھا دی جائے گی اس وقت تک نہ وہ یہ ماننے کے لیے تیار ہیں کہ اس نبی دعوت کی تکذیب کے نتیجہ میں ان پر کوئی عذاب آ جائے گا اور نہ یہ تسلیم کرنے والے ہیں کہ فی الواقع آگے کوئی دن آنے والا ہے جس میں ان کو دائمی عذاب اور ابدی رسوائی سے دوچار ہونا پڑے۔

ضد اور ہٹ دھرمی کی اس ذہنیت کے سبب سے سابق سورہ میں بھی آپ نے دیکھا ہے کہ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِي وَنُذُرِ ۔ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ کی تذکیر بار بار دہرائی گئی ہے اور اس سورہ میں فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ کی تنبیہ بار بار آئی ہے۔ کسی ایک ہی بات کی طرف بار بار توجہ دلانے کا یہ اسلوب ظاہر ہے کہ اسی صورت میں اختیار کیا جاتا ہے جب مخاطب یا تو اتنا ضدی ہو کہ اپنی خواہش کے خلاف کوئی بات ماننے کے لیے تیار ہی نہ ہو یا اتنا غبی ہو کہ جب تک اس کو کان پکڑ پکڑ کر ایک ایک چیز کی طرف توجہ نہ دلائی جائے اس سے کسی معقول بات کے سمجھنے کی توقع ہی نہ کی جا سکتی ہو۔

کلام میں مخاطب کی ذہنیت اور اس کے مزاج کی رعایت ایک ناگزیر شے ہے۔ اگر متکلم یہ چیز ملحوظ نہ رکھ سکے تو اس کا کلام نہ مطابقِ حال ہوگا، نہ بلیغ۔ جو لوگ کلام کے ان تقاضوں سے نابلد ہوتے ہیں وہ اس نوعیت کے کلام کی خوبیاں اور نزاکتوں کے پرکھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ وہ ایک ہی آیت کے بار بار اعادے کو تکرار پر محمول کرتے اور اس تکرار کو ایک عیب قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ اس سورہ پر بھی بعض کم سوادوں نے یہ اعتراض کیا ہے کہ اس میں ایک ہی آیت کا بار بار اعادہ ہے۔ حالانکہ اگر وہ سمجھ جائیں کہ اس میں مخاطب کس ذہنیت کے لوگ ہیں تو وہ پکار اٹھیں کہ اس سورہ کی ایک ایک ترجیع اپنے محل میں اس طرح جڑی ہوئی ہے جس طرح انگشتری میں نگینہ ہوتا ہے۔

سورۂ قمر میں قریش کے ہٹ دھرموں کو یہ بات سمجھائی گئی ہے کہ رسولوں اور ان کی قوموں کی تاریخ سے آخر کیوں سبق نہیں لیتے؟ کیوں اڑے ہوئے ہو کہ جب عذاب کا تازیانہ دیکھو لو گے تب ہی مانو گے؟ یہ تو اللہ تعالیٰ کا عظیم احسان ہے کہ اس نے تمھاری تعلیم و تذکیر کے لیے ایک ایسی کتاب اتاری جو ہر پہلو سے اس مقصد کے لیے نہایت موزوں ہے!

اس سورہ میں اسی مضمون کو ایک نئے اسلوب اور نہایت اچھوتے انداز سے لیا ہے اور انھیں یہ سمجھایا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی رحمانیت ہے کہ اس نے تمھاری تعلیم کے لیے قرآن اتارا۔ تمھاری فطرت کا تقاضا یہی تھا کہ اس مقصد کے لیے قرآن ہی اتارا جائے۔ جب اللہ نے تم کو نطق و بیان کی صلاحیت سے نوازا ہے تو تم بات سمجھ بھی سکتے ہو اور سمجھا بھی سکتے ہو۔ اس اعلیٰ صلاحیت کا حق یہی ہے کہ اسی کو تمھاری تعلیم کا ذریعہ بنایا جائے نہ کہ عذاب کے ڈنڈے کو، لیکن تمھاری یہ بدبختی ہے کہ تم اس نعمت و رحمت سے فائدہ اٹھانے کے بجائے کوئی نئی نشانی دیکھنے کے لیے مچلے ہوئے ہو۔ اگر کوئی نشانی ہی مطلوب ہے تو آسمان و زمین اور آفاق و انفس کی نشانیوں پر کیوں نہیں غور کرتے جو ہر روز تمھارے مشاہدے میں آتی ہیں اور تمھیں انہی حقائق کے درس دیتی ہیں جن کی دعوت قرآن دے رہا ہے۔ ان نشانیوں کے ہوتے کسی نئی نشانی کی کیا ضرورت ہے؟ اس کے بعد زمین و آسمان کی ایک ایک نشانی پر انگلی رکھ کر اور گویا ان ضدیوں کے کان پکڑ پکڑ کر توجہ دلائی ہے کہ یہ نشانیاں نہیں ہیں تو کیا ہیں! آخر اپنے رب کی کن کن نشانیوں کو جھٹلاتے رہو گے!

ب۔ اس سورہ کی بعض اہم مشکلات

اس سورہ میں زبان و اسلوب اور تاویل کی جو مشکلات ہیں ان سے تو ہم ان شاء اللہ متعلق آیات کے تحت ہی تعرض کریں گے لیکن دو باتیں ایسی ہیں جن کی وضاحت ہم تمہید ہی میں کر دینی چاہتے ہیں تاکہ ان سے بار بار تعرض کی نوبت نہ آئے۔ ان میں سے پہلی چیز لفظ 'اٰلَاءُ' کی تحقیق ہے اور دوسری 'فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ' میں خطاب کی نوعیت۔

لفظ 'اٰلاء' جمع ہے 'اِلٰی'، 'اَلٰی' اور 'اِلْیٌ' کی۔ اس کے معنی تمام ائمۂ لغت اور ارباب تاویل کے نزدیک نعمت کے ہیں، لیکن استاذ امام مولانا فراہیؒ نے اپنی کتاب 'مفردات القرآن' میں اہل لغت کی اس رائے سے اختلاف کیا ہے۔ مولاناؒ کے نزدیک یہ لفظ صرف نعمت کے معنی میں نہیں آتا بلکہ اس کے معنی اس سے وسیع ہیں۔ وہ اس بحث کی تمہید اس طرح اٹھاتے ہیں۔

> "ہر چند لوگوں کا اس بات پر اجماع ہے کہ 'اٰلاء' کے معنی نعمتوں کے ہیں لیکن قرآن اور کلام عرب سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔ کلام عرب کے تتبع اور لفظ کے مواقع استعمال سے جو بات ظاہر ہوتی ہے وہ تو یہ ہے کہ اس کے اصل معنی کارنامۂ کرشموں اور عجائب قدرت و حکمت کے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے کرشموں اور اس کی نشانیوں کا غالب حصہ آیات رحمت پر مشتمل ہے اس وجہ سے لوگوں نے یہ گمان کر لیا کہ 'اٰلآء' کے معنی نعمت ہی کے ہیں۔"

اسی سلسلہ میں مولاناؒ نے اس روایت کی بھی توجیہ کی ہے جو حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ انھوں نے اس کے معنی نعمت کے بتائے ہیں۔ مولاناؒ فرماتے ہیں کہ سلف کا طریقہ یہ رہا ہے کہ جب ان سے کوئی سوال کیا جاتا تو وہ سوال

کے موقع و محل کو سامنے رکھ کر جواب دیتے کہ اس خاص مقام میں لفظ کا کیا مفہوم ہے۔

اس تمہید کے بعد مولاناؒ نے شعرائے جاہلیت میں سے طرفہ، میبر بنت ضرار، مہلہل، ربیعہ بن مقروم، اجدع الہمدانی، فضالہ بن زید، خنساء اور بعض حماسی شعراء کے کلام سے اپنی تائید میں شواہد پیش کیے ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ مشہور جاہلی شاعروں نے، جن کا کلام لغت اور نحو کا ماخذ ہے، اس لفظ کو صرف نعمت ہی کے معنی میں نہیں لیا ہے بلکہ وسیع معنوں میں لیا ہے جس کے اندر نعمت، قدرت، شان، نشانی، کرشمہ، کارنامہ، اعجوبہ اور اس نوع کے تمام مفہوم شامل ہیں۔

ہمارے لیے یہ بات باعثِ مسرت ہے کہ قرآن مجید کے اس دور کے مترجمین و مفسرین مولاناؒ کی تحقیقات اپنی کتابوں میں (بلا حوالہ سہی) اب نقل کرنے لگے ہیں۔ لیکن مولاناؒ کی تصنیفات عربی میں ہیں اس وجہ سے جن کی عربی خام ہے بعض اوقات وہ غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اوپر کی تصریحات سے یہ بات واضح ہو گئی کہ اس لفظ کو نعمت کے معنی میں لینے سے مولاناؒ کو انکار نہیں ہے بلکہ صرف نعمت کے معنی میں اس کو محدود کر دینے سے انکار ہے۔

'فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ' میں خطاب سے متعلق یہ امر تمام اربابِ تاویل کے نزدیک متفق علیہ ہے کہ یہ جن و انس دونوں سے ہے۔ اس کی وضاحت خود قرآن نے اسی سورہ میں مختلف اسلوبوں سے کر دی ہے۔ البتہ دو سوال پیدا ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ قرآن کی دعوت جس طرح انسانوں کے لیے ہے کیا اسی طرح جنوں کے لیے بھی ہے، اگر اس کا جواب اثبات میں ہے تو کیا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح اللہ تعالیٰ کی حجت اپنی قوم پر تمام کی اسی طرح جنوں پر بھی کی۔

اس کا جواب ہمارے نزدیک یہ ہے کہ رسولوں کی بعثت اور ان کی دعوت سے متعلق اللہ تعالیٰ نے جو ضابطے قرآن میں بیان فرمائے ہیں ان کو سامنے رکھتے ہوئے یہ کہنا مشکل ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت جنوں کی طرف بھی تھی اور جس طرح آپ نے انسانوں پر حجت تمام کی اسی طرح جنوں پر بھی کی۔ قرآن میں یہ بات گوناگوں اسلوبوں سے واضح فرمائی گئی ہے کہ رسول جس قوم کی طرف بھیجا جاتا ہے وہ انہی کے اندر سے ہوتا ہے، انہی کی زبان میں کلام کرتا ہے، انہی کی فطرت کا اعلیٰ نمونہ ہوتا ہے اور وہ اپنی عملی مثال سے ان کے خیر کو اجاگر کرتا اور ان کے شر کو مٹاتا ہے اس وجہ سے اس کی زندگی ہر شخص کے لیے اُسوہ اور نمونہ بن جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ان میں سے کوئی ایک بات بھی ایسی نہیں ہے جو جنوں کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے ظہور میں آئی ہو۔

یہ بات بھی اپنی جگہ پر واضح ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی قوم کو دعوت دینے اور اس کی اصلاح و تربیت کے لیے جو جدوجہد فرمائی اس طرح کی کوئی جدوجہد جنوں کے اندر آپ کی طرف سے ہمارے علم میں نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ کوئی دعویٰ کیا جا سکتا ہے تو بس یہ کہ ایک دو بار آپ جنوں کی کسی پارٹی سے ملے

ہوں یا ان کی کسی پارٹی نے آپ کی زبان مبارک سے قرآن پاک کا کوئی حصّہ سنا اور اس کو پسند کیا ہو۔ سورۂ احقاف آیات ۲۹-۳۲ کے تحت گزر چکا ہے اور آگے سورۂ جنّ میں ذکر آئے گا کہ جنّوں کی ایک پارٹی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے قرآن پاک کی کچھ آیتیں سنیں اور ان کو نہایت پسند کیا، لیکن وہاں بھی اس امر کی تصریح ہے کہ جنّوں کی اس پسندیدگی کی اطلاع حضورؐ کو براہِ راست نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی وحی کے ذریعہ سے ہوئی۔ اس طرح کی اتفاقی ملاقاتیں ظاہر ہے کہ اس دعوت اور اتمامِ حجّت کے لیے کافی نہیں ہیں جو ہر نبی و رسول نے اپنی قوم کے لیے انجام دی ہیں اور جس کے لیے ہی درحقیقت کسی قوم کے اندر رسول کی بعثت ہوتی ہے۔ قرآن میں جنّوں سے اس طرح کے خطاب کہیں کہیں جو پائے جاتے ہیں اس کی وجہ ہمارے نزدیک یہ نہیں ہے کہ وہ بھی براہِ راست اس کے مخاطب ہیں بلکہ جب ابرِ رحمت برستا ہے تو جس طرح خشک و تر سب کو سیراب کر دیتا ہے اسی طرح کبھی کبھی قرآن کی رحمت کا فیض جنّوں تک بھی متعدی ہو جاتا ہے۔ بالخصوص ان کلیاتی امور میں جو ہمارے اور ان کے درمیان مشترک ہیں۔ توحید، معاد، جزا و سزا، حق اور عدل اور اس نوع کے امور ہمارے اور ان کے مابین بالکل یکساں ہیں۔ اختلاف ہو سکتا ہے تو ان امور میں ہو سکتا ہے جن کا تعلق ہماری اور ان کی نوعی خصوصیات سے ہے۔ اس سورہ کا اصل مقصد، جیسا کہ اوپر واضح ہو چکا ہے، اللہ تعالیٰ کی قدرت و حکمت اور رحمت و ربوبیت کی نشانیوں کی یاددہانی اور غافلوں کو جھنجھوڑنا اور جگانا ہے اس وجہ سے غافل انسانوں کے ساتھ ساتھ اس میں غافل جنّوں کو بھی مخاطب کر لیا ہے جس سے اس کلام کی ہیبت تمام آفاق پر چھا گئی ہے۔

ممکن ہے یہاں کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ اس تقریر کا نتیجہ تو یہ نکلتا ہے کہ جس طرح انسانوں کے اندر انسانوں میں سے نبی اور رسول آئے اسی طرح جنّوں کے اندر انہی کے اندر سے نبی و رسول آئے ہوں جنھوں نے ان کی زبان اور ان کی نوعی خصوصیات و ضروریات کے مطابق ان کی اصلاح و تربیت کی ہو۔ ہم اس نتیجہ کی ذمہ داری قبول کرتے ہیں۔ یہ بات عقل و فطرت کے ٹھیک مطابق اور اللہ تعالیٰ کی اس سنت کے بالکل موافق ہے جو اس نے نبیوں اور رسولوں کی بعثت سے متعلق قرآن میں بار بار واضح فرمائی ہے۔ جنّات جب ہماری ہی طرح مکلّف، اور ہماری ہی طرح عنداللہ مسئول اور ہماری ہی طرح اپنے اعمال کی جزا یا سزا کے سزاوار ہیں تو سنتِ الٰہی کے مطابق ضروری ہے کہ ان کی ہدایت کے لیے نبی اور رسول بھی مبعوث ہوئے ہوں اور یہ بھی ضروری ہے کہ وہ انہی کے اندر سے اٹھائے گئے ہوں اور انہی کی زبان میں انھوں نے ان کو دعوت دی ہو۔ ہمارے نزدیک قرآن میں کوئی ایسی آیت نہیں ہے جو اس کے خلاف جاتی ہو بلکہ مختلف آیات سے نہایت واضح طور پر اس کی تائید ہوتی ہے۔

سورۂ بقرہ میں آدمؑ و ابلیس کا جو ماجرا بیان ہوا ہے اس کے آخر میں آدمؑ و ابلیس دونوں سے بحیثیت جماعت خطاب کر کے فرمایا ہے کہ

قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِیْعًا ج — ہم نے حکم دیا کہ یہاں سے اترو سب۔ پس اگر تمھارے

فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (البقرۃ : ۳۸)

پاس میری طرف سے کوئی ہدایت آئے تو جو میری ہدایت کی پیروی کریں گے ان پر نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی ہدایت بھیجنے کا جو وعدہ فرمایا ہے وہ جس طرح آدمؑ و اولادِ آدم سے متعلق ہے اسی طرح ابلیس اور اس کی ذریت سے متعلق بھی ہے۔

اسی طرح دوسرے مقام میں تصریح ہے کہ جنوں کے اندر انہی کے اندر سے رسول مبعوث ہوئے :

يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ وَيُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ۭ قَالُوْا شَهِدْنَا عَلٰٓي اَنْفُسِنَا وَغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَشَهِدُوْا عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ (الانعام : ۱۳۰)

اے جنوں اور انسانوں کے گروہ، کیا تمہارے پاس تمہی میں سے رسول میری آیتیں بیان کرتے اور تمہیں اس دن کی پیشی سے ڈراتے نہیں آئے؟ وہ جواب دیں گے کہ ہاں ہم خود اپنے خلاف گواہ ہیں۔ اور ان کو دنیا کی زندگی نے دھوکے میں رکھا اور انھوں نے خود اپنے خلاف گواہی دی کہ وہ کافر ہے۔

ج ۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

اس سورہ کا نظم بالکل واضح ہے۔ ابتدا میں یہ تمہید ہے کہ قرآن خدائے رحمان کی رحمت کا مظہر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا اور اپنے فضلِ خاص سے اس کو نطق و ادراک اور گویائی کی اعلیٰ صلاحیتوں سے نوازا۔ ان اعلیٰ صلاحیتوں کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی تعلیم و تربیت اعلیٰ ترین آسمانی کلام —— قرآن —— کے ذریعہ سے کی جائے نہ کہ عذاب کے تازیانے کے ذریعہ سے۔ بدقسمت ہیں وہ لوگ جو اس کتاب سے رہنمائی حاصل کرنے کے بجائے کسی نشانیٔ عذاب کا مطالبہ کر رہے ہیں۔

اس کے بعد آفاق و انفس کی نمایاں نشانیوں پر گویا انگلی رکھ رکھ کے انسانوں اور جنوں، دونوں کو بار بار جھنجھوڑا ہے کہ یہ ساری نشانیاں ہی تو ہیں، تو تم اپنے رب کی کن کن نشانیوں کو جھٹلاؤ گے!

ان نشانیوں کے بیان کی ترتیب یہ ہے۔

ان نشانیوں کی طرف اشارہ جو شہادت دیتی ہیں کہ خالقِ کائنات عدل پسند ہے۔ اپنی اس دنیا کے کسی گوشے میں وہ تعدّی، طغیان اور حدود سے تجاوز کو پسند نہیں فرماتا۔

ان نشانیوں کی طرف اشارہ جو شہادت دیتی ہیں کہ خالق نے اس دنیا میں ربوبیت کا جو وسیع انتظام فرمایا ہے وہ مقتضی ہے کہ انسان اس میں شترِ بے مہار بنا کر نہیں چھوڑا گیا بلکہ لازماً ایک ایسا دن بھی آنے والا ہے جس میں اللہ تعالیٰ لوگوں کا حساب کرے گا۔ جو انعام کے مستحق ٹھہریں گے ان کو انعام دے گا اور جو سزا کے سزاوار نکلیں گے ان کو سزا دے گا۔

- خدا ہی نے جنّوں اور انسانوں کو آگ اور مٹی سے پیدا کیا اور وہ ان کو دوبارہ بھی پیدا کر سکتا ہے۔ اس کام میں اس کو کوئی زحمت نہیں پیش آئے گی۔
- یہ ساری کائنات خدا ہی کے تصرّف میں ہے۔ مشرق اور مغرب، دونوں کا رب وہی ہے۔ جو طلوع ہوتے ہیں اسی کے حکم سے طلوع ہوتے ہیں اور جو ڈوبتے ہیں اسی کے حکم سے ڈوبتے ہیں۔
- اس کائنات کے اضداد میں ان کے اپنے وجود سے بالاتر مقصد کے لیے سازگاری پائی جاتی ہے جو اس بات کی شہادت ہے کہ ایک بالاتر ارادہ سب پر حاوی ہے جو ان تمام اضداد کے اندر توافق پیدا کرتا اور ان کو اس کائنات کے مجموعی مفاد کے لیے استعمال کرتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ کائنات اپنے اضداد کے تصادم سے فنا ہو جاتی۔ اس کا باقی رہنا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ اس پوری کائنات پر صرف ایک ہی قاہر و حکیم ارادہ کارفرما ہے۔
- اس بات کی نشانی کہ صرف وہی ایک ذات باقی رہنے والی ہے۔ اس کے سوا سب فانی ہیں۔
- اس حقیقت کا اظہار کہ اس کے سوا سب محتاج ہیں۔ وہی اکیلا محتاج الیہ ہے۔ سب کی ضرورتیں وہی پوری کرتا ہے۔ جو نادان دوسروں سے مانگتے ہیں وہ بھی پاتے اسی سے ہیں۔
- اس امر کا اعلان کہ حساب کتاب اور جزائے اعمال کا ایک دن ضرور آئے گا اور اس دن نہ کوئی انسان خدا کے قابو سے باہر نکل سکے گا نہ کوئی جن۔ اس دن کسی مجرم کا جرم ثابت کرنے کے لیے کسی ثبوت اور گواہی کی ضرورت نہیں ہوگی بلکہ مجرموں کی پیشانیاں خود ان کے مجرم ہونے کی گواہی دیں گی پھر وہ چوٹی اور پاؤں سے پکڑ کر جہنم میں جھونک دیے جائیں گے۔
- اس دن مقرّبین کو جو جنتیں ملیں گی ان کا بیان۔
- اصحاب الیمین کو ملنے والی جنتوں کی تصویر۔

سُوۡرَةُ الرَّحۡمٰن (۵۵)

مَكِّيَّةٌ ———— اٰيات: ۷۸

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

آيات ۱-۳۰

اَلرَّحۡمٰنُ ﴿۱﴾ عَلَّمَ الۡقُرۡاٰنَ ﴿۲﴾ خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ ﴿۳﴾ عَلَّمَهُ
الۡبَيَانَ ﴿۴﴾ اَلشَّمۡسُ وَالۡقَمَرُ بِحُسۡبَانٍ ﴿۵﴾ وَّالنَّجۡمُ وَالشَّجَرُ
يَسۡجُدٰنِ ﴿۶﴾ وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الۡمِيۡزَانَ ﴿۷﴾ اَلَّا تَطۡغَوۡا
فِى الۡمِيۡزَانِ ﴿۸﴾ وَاَقِيۡمُوا الۡوَزۡنَ بِالۡقِسۡطِ وَلَا تُخۡسِرُوا الۡمِيۡزَانَ ﴿۹﴾
وَالۡاَرۡضَ وَضَعَهَا لِلۡاَنَامِ ﴿۱۰﴾ فِيۡهَا فَاكِهَةٌ وَّالنَّخۡلُ ذَاتُ
الۡاَكۡمَامِ ﴿۱۱﴾ وَالۡحَبُّ ذُو الۡعَصۡفِ وَالرَّيۡحَانُ ﴿۱۲﴾ فَبِاَىِّ اٰلَآءِ
رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۱۳﴾ خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ مِنۡ صَلۡصَالٍ كَالۡفَخَّارِ ﴿۱۴﴾
وَخَلَقَ الۡجَآنَّ مِنۡ مَّارِجٍ مِّنۡ نَّارٍ ﴿۱۵﴾ فَبِاَىِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا
تُكَذِّبٰنِ ﴿۱۶﴾ رَبُّ الۡمَشۡرِقَيۡنِ وَرَبُّ الۡمَغۡرِبَيۡنِ ﴿۱۷﴾ فَبِاَىِّ
اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۱۸﴾ مَرَجَ الۡبَحۡرَيۡنِ يَلۡتَقِيٰنِ ﴿۱۹﴾ بَيۡنَهُمَا
بَرۡزَخٌ لَّا يَبۡغِيٰنِ ﴿۲۰﴾ فَبِاَىِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۲۱﴾ يَخۡرُجُ
مِنۡهُمَا اللُّؤۡلُؤُ وَالۡمَرۡجَانُ ﴿۲۲﴾ فَبِاَىِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۲۳﴾

النصف

وَلَهُ الْجَوَارِ الْمُنْشَآتُ فِي الْبَحْرِ كَالْأَعْلَامِ ﴿۲۴﴾ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ﴿۲۵﴾ كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ﴿۲۶﴾ وَيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ ﴿۲۷﴾ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ﴿۲۸﴾ يَسْأَلُهُ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ ﴿۲۹﴾ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ﴿۳۰﴾

ع ۲۵ ۱۱

ترجمہ آیات ۱-۳۰

خدائے رحمان نے قرآن کی تعلیم دی۔ اس نے انسان کو پیدا کیا۔ اس کو گویائی سکھائی۔ ۱-۴

سورج اور چاند ایک حساب سے گردش کرتے ہیں۔ اور ستارے اور درخت بھی سجدہ کرتے ہیں۔ اور اس نے آسمان کو اونچا کیا اور اس میں میزان رکھی کہ تم بھی میزان میں تجاوز نہ کرو اور ٹھیک تولو پورے انصاف کے ساتھ۔ اور وزن میں کمی نہ کرو۔ ۵-۹

اور زمین کو اس نے بچھایا خلق کے لیے اس میں میوے اور کھجوریں ہیں جن پر غلاف چڑھے ہوئے ہیں اور بھُس والے اناج بھی ہیں اور خوشبودار پھول بھی —— تو اے جنو اور انسانو! تم اپنے رب کی کن کن عنایتوں کو جھٹلاؤ گے! ۱۰-۱۳

اس نے پیدا کیا انسان کو ٹھیکرے کی طرح کھنکھناتی مٹی سے اور پیدا کیا جنات کو شُعلۂ آتش سے تو تم دونوں اپنے رب کی کن کن قدرتوں کو جھٹلاؤ گے! ۱۴-۱۶

وہی مشرق کے دونوں اطراف کا خداوند ہے اور وہی مغرب کے دونوں اطراف کا بھی خداوند ہے تو تم اپنے رب کی کن کن عظمتوں کو جھٹلاؤ گے! ۱۷-۱۸

اس نے چھوڑے دو دریا، دونوں ٹکراتے ہیں لیکن ان کے درمیان ایک پردہ حائل رہتا ہے جس سے وہ تجاوز نہیں کرتے تو تم اپنے رب کے کن کن کرشموں کو جھٹلاؤ گے! ۱۹-۲۱

ان دونوں ہی سے نکلتے ہیں موتی اور مونگے، تو تم اپنے رب کی کن کن نیرنگیوں کو

جھٹلاؤ گے! ۲۲-۲۳

اسی کے اختیار میں ہیں سمندروں میں پہاڑوں کی طرح اٹھے ہوئے جہاز۔ تو تم اپنے رب کے کن کن عجائب کو جھٹلاؤ گے! ۲۴-۲۵

روئے زمین پر جو بھی ہیں سب فانی ہیں اور تیرے رب کی عظمت و عزت والی ذات باقی رہنے والی ہے تو اپنے رب کی کن کن شانوں کو جھٹلاؤ گے! ۲۶-۲۸

اسی سے مانگتے ہیں جو بھی آسمانوں اور زمین میں ہیں۔ وہ ہر وقت ایک نئی شان میں ہے تو تم اپنے رب کی کن کن شانوں کو جھٹلاؤ گے! ۲۹-۳۰

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اَلرَّحْمٰنُ ۝ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ (۱-۲)

قرآن اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی رحمت ہے

یعنی اللہ تعالیٰ کی یہ خاص مہربانی ہے کہ اس نے تمہاری تعلیم و تذکیر کے لیے قرآن کریم جیسی رحمت و برکت نازل فرمائی۔ وہ چاہتا تو تمہاری طلب کے مطابق تم پر عذاب بھی بھیج سکتا تھا، لیکن اس نے غایت رحمت کے سبب سے تم کو اپنے صحیفۂ رحمت سے نوازا کہ تم اس کو پڑھو، سمجھو اور اس کی روشنی میں اپنی عقلی و عملی کج رویوں کی اصلاح کر کے اس دنیا میں بھی پھلو پھولو اور آخرت میں بھی فلاح پاؤ — مطلب یہ ہے کہ جب تمہارے ربِّ رحمان نے تمھیں اپنی رحمت سے نوازا تو تم رحمت کی جگہ اس کی نقمت کے طالب کیوں بنتے ہو!

خَلَقَ الْاِنْسَانَ ۝ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ (۳-۴)

انسان کی فطرت مقتضی تھی کہ اس کی ہدایت کے لیے قرآن نازل ہو

یعنی اللہ تعالیٰ کی رحمانیت کے تقاضے کے ساتھ ساتھ انسان کی خلقت اور اس کی صفات کا تقاضا بھی یہی ہوا کہ اس کی رہنمائی کے لیے صحیفۂ ہدایت اترے نہ کہ تازیانۂ عذاب۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا اور اس کو نطق و گویائی کی تعلیم دی۔ یہ گویائی اس بات کی شہادت ہے کہ خالق نے اس کو ایک عاقل و مدرک ہستی بنایا ہے۔ وہ بات سننے اور سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہے، اس کے خیر و شر میں امتیاز کر سکتا ہے اور دوسروں تک بھی اس کو پہنچا اور ان کو سمجھا سکتا ہے۔ جب ان گوناگوں صلاحیتوں سے وہ آراستہ ہے تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ قدرت نے یہ چاہا ہے کہ اس کو کلام کے ذریعہ سے تعلیم دی جائے نہ کہ جانوروں کی

کی طرح ڈنڈے کے ذریعے سے۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ انسان میں نطق کی صلاحیت اس کے اندر دوسری گوناگوں صلاحیتوں کی شاہد ہے۔ یہ نطق مستلزم ہے کہ انسان عاقل و مدرک ہے، وہ کلیات سے جزئیات اور جزئیات سے کلیات بنا سکتا ہے، وہ استدلال، استنباط اور اجتہاد کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ارسطو نے اسی وجہ سے انسان کی اسی صفت کو اس کے لیے حیوانات سے ممتاز کرنے والی صفت قرار دیا ہے۔ یہ صفت اس کے اندر نہ پائی جائے تو پھر وہ انسان نہیں بلکہ دو ٹانگوں پر چلنے والا ایک جانور ہے۔ اور یہیں سے یہ بات بھی نکلی کہ جو لوگ کسی حقیقت کو دلائل کی روشنی میں سمجھنے کی جگہ اس کو آنکھوں سے دیکھ کر ماننے کے منتظر ہیں وہ بھی جانوروں ہی کے گلے میں شامل ہیں، اگرچہ وہ رہتے شاندار بنگلوں میں ہوں۔

اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ ۝ وَّالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدٰنِ (۵-۶)

کائنات کی نشانیوں کی طرف ایک اشارہ

یہ اس کائنات کی نشانیوں کی طرف توجہ دلائی کہ اگر قرآن کے انذار کی تصدیق کے لیے نشانیوں ہی کی ضرورت ہے تو کسی نئی نشانی کے منتظر کیوں ہو؟ اپنے سروں کے اوپر آسمان کی نشانیوں کو دیکھو، یہ سورج اور چاند کس پابندیٔ اوقات اور کس نظم و ضبط کے ساتھ اپنے اپنے مدار میں گردش کر رہے ہیں۔ مجال نہیں ہے کہ کبھی منٹ اور سکینڈ کا بھی کوئی فرق واقع ہونے پائے۔ پھر یہ دیکھو کہ یہ کس طرح ان حدود و قیود کی پابندی کر رہے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے ٹھہرا دیے ہیں۔ یہ کبھی نہیں ہوتا کہ سورج اپنی سرحدیں لانگ کر چاند کے مدار میں گھس جائے یا چاند سورج کے حدود میں دراندازی کر دے۔ لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ؕ وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ (یٰسٓ: ۴۰) (نہ سورج کے لیے یہ روا کہ وہ چاند کو جا پکڑے اور نہ رات کو یہ حق کہ وہ دن سے سبقت کر جائے۔ ہر ایک اپنے اپنے مدار میں گردش کر رہا ہے)۔ کیا یہ نشانی ہر روز انسان کو یہ درس نہیں دیتی کہ جب اس کائنات کے خالق نے سورج اور چاند جیسی عظیم مخلوقات کو اپنے حدود و قیود کا پابند کر رکھا ہے تو انسان کو وہ کیوں اپنے امر و نہی کی پابندی سے آزاد رکھے گا؟ اور اگر انسان اس کے حدود و قیود کو توڑ کر دنیا میں اودھم مچانے کی جسارت کرے گا تو وہ آخر اس کو کیوں سزا نہیں دے گا؟ جو قانون اس نے اس کائنات کے ہر گوشے میں نافذ کر رکھا ہے اس کی پابندی کا سب سے زیادہ سزاوار تو انسان ہے۔

وَّالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدٰنِ۔ شمس و قمر کی پابندیٔ حدود، جس کو شریعت کی اصطلاح میں تقویٰ سے تعبیر کرتے ہیں، کا حوالہ دینے کے بعد یہ آسمان کے ستاروں اور زمین کے درختوں کے سجدے کا ذکر فرمایا کہ یہ بھی اپنے خالق و مالک کو سجدہ کرتے اور اپنے عمل سے انسان کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ بھی اپنے رب سے سرکشی نہ کرے بلکہ نہایت فرمانبردارانہ اس کو سجدہ اور اس کی بندگی کرے۔

ستاروں اور درختوں کے سجدے کی وضاحت اس کتاب میں جگہ جگہ ہو چکی ہے۔ اس بحث کو اس کے محل

میں دیکھیے۔ یہاں اعادے میں طوالت ہوگی۔

'النجم' سے بعض لوگوں نے زمین پر پیدا ہونے والے چھوٹے پودے، جھاڑ اور بیلوں وغیرہ کے قسم کی چیزیں مراد لی ہیں۔ غالباً 'یسجد' کے ساتھ ستاروں کی مناسبت ان حضرات کی سمجھ میں نہیں آئی اس وجہ سے انھیں یہ تکلف کرنا پڑا حالانکہ ان دونوں کے درمیان نہایت واضح وصفی اشتراک موجود ہے۔ قرآن میں دونوں کے سجدہ کا ذکر مختلف اسلوبوں سے بار بار آیا ہے۔ اسی اشتراک کی بنا پر یہاں بھی دونوں کا ذکر ساتھ ساتھ ہوا۔ اس سے آسمان و زمین دونوں کی ہم آہنگی واضح ہوتی ہے کہ ان کا رب ایک ہی ہے جس کو آسمان کے ستارے بھی سجدہ کرتے ہیں اور زمین کے درخت بھی۔ یہ امر واضح رہے کہ مجاہدؒ، قتادہؒ اور حسنؒ وغیرہ 'نجوم' کو اس کے معروف معنی ہی میں لیتے ہیں۔ ابن کثیرؒ نے بھی انہی لوگوں کی تائید کی ہے اور آیت 'اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ یَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ' (الحج: ۱۸) (نہیں دیکھتے کہ اللہ ہی کو سجدہ کرتے ہیں جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں اور سورج، چاند اور ستارے بھی) کا حوالہ دیا ہے۔

النجم '
میم مفہوم

وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِیْزَانَ (۷)

آسمان کی بعض روشن نشانیوں کی طرف توجہ دلانے کے بعد خود آسمان کی طرف توجہ دلائی کہ اس کو دیکھو، ستونوں کے بغیر کس طرح تمہارے رب نے ایسی ناپیدا کنار چھت بلند کر دی جس کی وسعتوں کا کوئی اندازہ نہیں کر سکتا۔ پھر دیکھو کہ اس بے پایاں عظمت و وسعت کے باوصف اس میں اس نے ایسا توازن رکھا ہے کہ اس کے کسی کونے گوشے میں نہ کوئی کسی جھول کا پتہ دے سکتا ہے نہ کسی رخنے اور دراڑ کا۔ دوسرے مقام میں اسی حقیقت کی طرف یوں توجہ دلائی ہے:

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا وَاَلْقٰی فِی الْاَرْضِ رَوَاسِیَ اَنْ تَمِیْدَ بِکُمْ (لقمان: ۱۰)	اس نے آسمانوں کو پیدا کیا بغیر ایسے ستونوں کے جو تمھیں نظر آئیں اور زمین میں پہاڑوں کے لنگر ڈال دیے کہ مبادا وہ تمھارے سمیت کسی سمت کو ڈھک جائے۔

سورۂ ملک میں فرمایا ہے:

اَلَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ؕ مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ؕ فَارْجِعِ الْبَصَرَ ۙ هَلْ تَرٰی مِنْ فُطُوْرٍ ۞ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ کَرَّتَیْنِ یَنْقَلِبْ اِلَیْکَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِیْرٌ (الملک: ۳-۴)	وہی ہے جس نے تہ بر تہ سات آسمان بنائے اور تم خدائے رحمان کی اس کاریگری میں کوئی نقص نہیں پا سکتے۔ نگاہ دوڑاؤ، کیا دیکھتے ہو کہیں کوئی خلل! پھر نگاہ دوڑاؤ بار بار، نگاہ ناکام اور تھک کر واپس آ جائے گی۔

'بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا' سے یہ بات نکلتی ہے کہ آسمان کی چھت میں توازن (میزان) قائم رکھنے کے لیے

اللہ تعالیٰ نے جذب وکشش کے لیے ستون استعمال کیے ہیں جو دوسروں کو نظر نہیں آتے۔

اَلَّا تَطۡغَوۡا فِی الۡمِیۡزَانِ (۸)

آسمان کے خالق کی پسند کا اظہار اس کی صنعت سے

یعنی جب خالق نے اس کے اندر میزان رکھی جس پر یہ قائم ہے، یہ نہ ہو تو آسمان درہم برہم ہو جائے تو اس سے خالق کا مزاج اور اس کا ذوق معلوم ہوا کہ وہ چاہتا ہے کہ انسان بھی اپنے دائرۂ اختیار کے اندر اسی طرح توازن، عدل اور قسط کو ملحوظ رکھے۔ اس میزان میں کوئی خرابی نہ پیدا کرے ورنہ سارے نظامِ معاش ومعیشت میں فساد پھیل جائے گا۔ مطلب یہ نکلا کہ اسی عدل وقسط کی دعوت تمھیں قرآن دے رہا ہے جس کی شہادت تمھارے سروں پر پھیلے ہوئے آسمان کے ہر گوشے سے مل رہی ہے اور اسی کی خلاف ورزی کے نتائج سے تمھیں وہ ڈرا رہا ہے کہ اگر تم نے اپنے طغیان سے اندھے ہو کر یہ میزان درہم برہم کر ڈالی تو اس کی سزا اس دنیا میں بھی بھگتو گے اور آخرت میں بھی اس کا وبال تم پر آئے گا تو آخر یہ واضح بات جس کی شہادت آسمان وزمین کے گوشے گوشے سے مل رہی ہے، تمھاری سمجھ میں کیوں نہیں آتی! آفاق کی ان سبق آموز نشانیوں کو نظر انداز کر کے کسی صاعقۂ عذاب کے درپے کیوں ہو!

وَاَقِیۡمُوا الۡوَزۡنَ بِالۡقِسۡطِ وَلَا تُخۡسِرُوا الۡمِیۡزَانَ (۹)

اوپر والی بات ایک کلیہ کی حیثیت سے بیان ہوئی تھی۔ اسی کلیہ پر مبنی ایک دوسری حقیقت کی طرف توجہ دلائی جس کا تعلق ہماری روزمرہ زندگی سے ہے۔ فرمایا کہ جس خدا کے بنائے ہوئے آسمان کی چھت کے نیچے رہتے ہو جب وہ میزان رکھنے والا اور عدل پسند ہے تو اس کی دنیا میں ڈنڈی ماری کی زندگی نہ بسر کرو بلکہ ناپ تول میں پورے انصاف کے ساتھ وزن کو قائم رکھو اور ہرگز تول میں کوئی کمی نہ کرو۔ قومِ شعیب کی سرگزشت کے سلسلہ میں ہم اس حقیقت کی طرف اشارہ کر چکے ہیں کہ ناپ تول میں کمی کوئی منفرد برائی نہیں ہے بلکہ یہ پورے نظامِ تمدن میں فساد کی ایک خوفناک علامت ہے۔ یہاں ایک مزید حقیقت واضح ہوئی کہ یہ برائی درحقیقت اس میزان کے منافی ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے آسمان وزمین قائم فرمائے ہیں۔ اگر کوئی قوم اس فساد کو قبول کر لیتی ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ اس بنیاد ہی کے ڈھا دینے کے درپے ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے اس عالم کی تعمیر فرمائی ہے۔ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی بنائی ہوئی زمین پر ایسے لوگوں کو کبھی گوارا نہیں کر سکتا۔

یہاں یہ چیز بھی قابلِ غور ہے کہ ایک ہی بات مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں سے فرمائی گئی ہے۔ قرآن مجید پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اسلوب ان مواقع پر اختیار فرمایا گیا ہے جہاں اصل حکم کی خلاف ورزی نہایت خطرناک نتائج پر منتہی ہو سکتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ناپ تول میں کامل انصاف کا حکم ایک عظیم حکم ہے۔ یہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے اس میزانِ عدل کی ایک فرع ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے اس عالم کا نظام قائم فرمایا ہے اور یہیں سے یہ بات بھی نکلی کہ جو قوم اس میں فساد برپا کر دیتی ہے وہ

سارے نظامِ تمدن میں فساد برپا کر دیتی ہے۔

وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ ۙ فِیْهَا فَاكِهَةٌ ۙ وَّالنَّخْلُ ذَاتُ الْاَكْمَامِ ۖ وَالْحَبُّ ذُو الْعَصْفِ وَالرَّیْحَانُ (۱۰-۱۲)

زمین کے اسبابِ ربوبیت کی طرف اشارہ

آسمان کے عجائبِ قدرت کی طرف توجہ دلانے کے بعد یہ زمین کے اسبابِ ربوبیت کی طرف توجہ دلائی۔ آسمان کے لیے 'رفع' کا لفظ استعمال فرمایا تھا اس کے مقابل میں زمین کے لیے 'وضع' کا لفظ نہایت موزوں اور معنی خیز استعمال فرمایا کہ آسمان کو شامیانے کی طرح تان دیا اور زمین کو فرش کی طرح بچھا دیا تاکہ اس کی مخلوقات کے لیے یہ ایک آرام دہ مکان بن جائے۔ پھر جس طرح آسمان پر سورج، چاند اور ستاروں کے چراغ اور قمقمے لگا دیے کہ اس گھر کو روشنی اور حرارت حاصل ہوتی رہے اسی طرح اس گھر میں مختلف قسم کے پھلوں، غلّوں اور پھولوں کے انبار بھی لگا دیے کہ اس کے مکینوں کو غذا بھی حاصل ہو، اس کے پھلوں سے وہ لذت اندوز اور خوش کام ہوں اور اس کے پھول ان کے لیے باصرہ نوازی اور معطر مشامی کا سامان بھی مہیا کریں۔

یہاں غلّے کے ساتھ پھلوں اور خاص طور پر پھولوں کا ذکر اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے صرف پیٹ بھرنے ہی کا سامان نہیں کیا ہے بلکہ ان کے ذوقِ جمال، لذتِ کام و دہن اور شوقِ آرائش کا بھی سامان کیا ہے جو اس کی ربوبیت ہی کی دلیل نہیں بلکہ خاص اہتمامِ ربوبیت کی دلیل ہے۔ اسی طرح 'حَبّ' کے ساتھ 'ذوالعصف' کی صفت اور 'نخل' کے ساتھ 'ذات الاکمام' کی صفت اس خاص عنایت پر دلیل ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر فرمائی ہے کہ اس نے غلّے اور پھل جو دیے تو اس طرح نہیں کہ گویا پھینک مارے ہوں بلکہ ایک ایک دانے اور ایک ایک پھل کی پیکنگ کا ایسا اعلیٰ انتظام فرمایا ہے کہ انسان اس کو دیکھ کر دنگ رہ جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ اہتمام اسی لیے فرمایا گیا ہے کہ انسان اپنے رب کی اس پروردگاری کا حق پہچانے، اس کا شکرگزار رہے، اور یہ حقیقت ہمیشہ پیشِ نظر رکھتے ہوئے زندگی گزارے کہ جس نے اس کے لیے یہ سارا اہتمام کسی استحقاق کے بغیر کیا ہے وہ اس کو یوں ہی شترِ بے مہار کی طرح چھوڑے نہیں رکھے گا بلکہ حساب کتاب کا بھی ایک دن وہ لائے گا۔

اس آیت میں لفظ 'ریحان' سے متعلق ایک تنبیہ بھی ضروری ہے۔ بعض لوگوں نے اس کے معنی 'پتّوں' کے لیے ہیں لیکن اس معنی میں یہ لفظ نہ عربی زبان میں استعمال ہوا ہے اور نہ یہاں پتّوں کے ذکر کا کوئی محل ہے۔ معلوم ہوتا ہے غلّہ کے ذکر کے ساتھ پھول کا ذکر ان حضرات کو بے جوڑ سا معلوم ہوا اس وجہ سے انھیں یہ انوکھی تاویل کرنی پڑی حالانکہ اس کے ذکر کا ایک محل ہے جس کی وضاحت ہم نے اوپر کر دی۔

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ (۱۳)

جنوں کو خطاب کرنے کی ایک خاص وجہ

یہ آیت آگے بار بار آئے گی اور یہ اس سورہ کی اہم ترین آیت ہے اس وجہ سے ہم نے تمہید ہی میں لفظ 'آلاء' کی تحقیق بھی بیان کر دی ہے اور اس میں جنوں اور انسانوں سے جو خطاب ہے اس کی نوعیت پر بھی

روشنی ڈالی ہے۔ البتہ ایک بات ہم یہاں واضح کریں گے وہ یہ کہ قریش کے مکذبین کے ساتھ جنات کے مکذبین کو بھی یہاں جو شامل کر لیا ہے تو اس کی ایک خاص وجہ ہے کہ تکذیب کی یہ مہم اس دور میں پوری شدت اختیار کر گئی تھی اور شیاطینِ انس و جن، دونوں گٹھ جوڑ کر کے اپنا پورا زور صرف کر رہے تھے کہ دعوتِ حق کے قدم اکھاڑ دیں۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے دونوں کو براہِ راست خطاب کر کے ان کو سرزنش بھی فرمائی اور آگے کی آیات سے معلوم ہوگا کہ ان کو چیلنج بھی کیا ہے کہ وہ اپنا سارا زور لگا کر دیکھ لیں، کلمۂ حق ان کے علی الرغم بلند ہو کر رہے گا۔ تمہید میں یہ بات ہم واضح کر چکے ہیں کہ یہ سورہ مکی زندگی کے اس دور میں نازل ہوئی ہے جب قریش پر ضد اور مخاصمت کا بخار پوری شدت کے ساتھ چڑھا ہوا تھا۔ اس دور میں ظاہر ہے کہ ان کو شیاطینِ جن کی کمک بھی سب سے زیادہ حاصل ہوئی ہوگی۔ یہ صورتِ حال مقتضی ہوئی کہ دونوں مخاطب کیے جائیں۔

منعم کی شکرگزاری فطرت کا تقاضا ہے

نعمت کے ساتھ منعم کی شکرگزاری اور ربوبیت کے ساتھ مسئولیت کا احساس انسانی فطرت کا ایک بدیہی تقاضا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی نعمتوں سے ایک شخص متمتع تو ہو رہا ہے لیکن وہ یہ تسلیم نہیں کرتا کہ ان کے عوض میں اس کے اوپر نعمتوں کے بخشنے والے کا کوئی حق بھی قائم ہوتا ہے یا ان کے باب میں اس سے کوئی پرسش بھی ہونی ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ ان تمام نعمتوں کا مکذب ہے۔ قرآن نے یہاں اسی تکذیب پر قریش اور ان کے ہم مشرب جنوں کو سرزنش فرمائی ہے کہ ہر قدم پر تمہارے سامنے تمہارے رب کی وہ نعمتیں موجود ہیں جو تمہیں روزِ جزا و سزا کی یاد دہانی کر رہی ہیں لیکن تم اس کا انکار کیے جا رہے ہو تو اس کی کن کن نعمتوں اور عنایتوں کی تکذیب کرو گے!

خَلَقَ الْإِنسَانَ مِن صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ ۝ وَخَلَقَ الْجَانَّ مِن مَّارِجٍ مِّن نَّارٍ ۝ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ۝ (۱۴-۱۶)

انسانی خلقت کے مختلف مراحل سے قیامت پر استدلال

یہ جنوں اور انسانوں دونوں کو ان کی خلقت یاد دلا کر ان کی دوسری خلقت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ اس غلط فہمی میں نہ رہو کہ تمہارا رب ایک مرتبہ پیدا کرنے کے بعد تمہیں دوبارہ پیدا کرنے پر قادر نہیں رہا اس وجہ سے اب کسی روزِ حساب کا معاملہ خارج از امکان ہو گیا۔ یاد رکھو کہ جس میٹیریل سے اس نے تم کو پیدا کیا ہے وہ میٹیریل بھی پوری مقدار میں موجود ہے اور خدا کی قدرتِ تخلیق بھی اسی طرح موجود ہے جس طرح تمہاری خلقتِ اوّل کے وقت موجود تھی تو اگر تم اپنی خلقت کا انکار نہیں کر سکتے تو اپنی دوبارہ پیدائش سے انکار کی بھی تمہارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔

'صلصال' خالص مٹی کو کہتے ہیں اور 'فخّار' اس مٹی کو کہتے ہیں جو ٹھیکرے کی طرح خشک ہو جائے۔ زندگی جن مراحل سے گزرتی ہوئی انسانیت کے مرحلے تک پہنچتی ہے قرآن نے جگہ جگہ ان تمام مراحل کا حوالہ دیا ہے۔ کہیں فرمایا ہے، انسان کو پانی سے پیدا کیا، کہیں مٹی کا حوالہ دیا ہے، کہیں سڑے ہوئے گارے کا ذکر کیا ہے۔ یہاں خشک مٹی کا ذکر ہے۔ اسی طرح سب سے آخری مرحلہ یہ بیان ہوا ہے کہ نطفہ سے اس

کی نسل جاری کی۔ یہ انسانی زندگی کے ارتقائی مراحل ہیں جن کی وضاحت سورۂ حجر آیت ۲۶ کے تحت ہو چکی ہے۔ ان مراحل کے بیان سے مقصود انسان کو خود اس کے وجود کے اندر خدا کی شانوں، قدرتوں اور حکمتوں کا مشاہدہ کرانا ہے تاکہ انسان پر یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جائے کہ یہ خدا ہی کی شان ہے کہ اس نے اس کو پانی اور کیچڑ سے نکالا، پھر میدانی علاقوں کی خشک و معتدل آب و ہوا میں اس کی پرورش کی، پھر درجہ بدرجہ اس کو ایک نیا ہیولیٰ بخشا اور اس کی نسل چلانے کے لیے ایک نیا نظام قائم فرمایا۔ ان باتوں کے بیان سے ظاہر ہے کہ مقصود یہ ثابت کرنا ہے کہ جس انسان کو اللہ تعالیٰ ان طویل راستوں سے گزار کر اس اہتمام سے یہاں تک لایا ہے اس کا وجود بے غایت و بے مقصد نہیں ہو سکتا اور ساتھ ہی یہ دکھانا بھی ہے کہ جو خدائے علیم و حکیم کیچڑ کے اندر پیدا ہونے والے ایک خلیہ کو انسان بنا دے سکتا ہے اس کی قدرت سے کوئی بات بھی بعید نہیں ہے، وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

جنات کی خلقت آگ کے شعلہ سے ہوئی

'وَخَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ'۔ مارج کے معنی شعلہ کے ہیں۔ شعلہ آگ کا خلاصہ ہوتا ہے۔ جس طرح انسان مٹی کے خلاصہ اور جوہر سے پیدا ہوا ہے اسی طرح جنات کی پیدائش آگ کے جوہر سے ہوئی ہے ان کے مدارج حیات کی زیادہ تفصیل قرآن نے نہیں کی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک بالکل مختلف نوع کے تمام مدارج خلقت کو سمجھنا ہمارے لیے نہایت مشکل تھا۔

اس کے بعد وہی آیتِ ترجیع ہے جس کی وضاحت اوپر ہو چکی ہے۔ اس کا مطلب یہاں یہ ہوگا کہ جب اپنے رب کی یہ شانیں اور یہ قدرتیں و حکمتیں خود اپنے وجود کے اندر مشاہدہ کرتے ہو تو اس بات کو کیوں بعید از امکان سمجھتے ہو کہ خدا تمھیں دوبارہ حساب کتاب کے لیے اٹھا کھڑا کرے، آخر اپنے رب کی کتنی نشانیوں کو جھٹلاتے اور نئی نشانیوں کا مطالبہ کرتے رہو گے!

رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ ۝ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (۱۷-۱۸)

مشرق اور مغرب کے مثنیٰ لانے کی وجہ

یعنی مشرق و مغرب، سب کا رب اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ نہ کوئی اس کے حدودِ مملکت سے باہر ہے اور نہ کوئی اس کی خدائی میں حصہ دار ہے۔ اللہ تعالیٰ تمام مشرق و مغرب کا بلا شرکت غیرے مالک ہے۔ اس کے آسمانوں اور زمین میں بالشت بھر علاقہ بھی کسی اور کے قبضہ میں نہیں ہے کہ وہ اس علاقہ والوں کو خدا کی پکڑ سے بچا لے۔ سورۂ معارج میں یہی مضمون اس طرح بیان ہوا ہے: 'فَلَآ اُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشٰرِقِ وَالْمَغٰرِبِ اِنَّا لَقٰدِرُوْنَ ۝ عَلٰٓی اَنْ نُّبَدِّلَ خَیْرًا مِّنْهُمْ لا وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِیْنَ' (۴۰-۴۱) (پس نہیں، میں قسم کھاتا ہوں مشرقوں اور مغربوں کے خداوند کی، ہم اس بات پر قادر ہیں کہ ان سے بہتر صورت میں بدل کر ان کو اٹھا کھڑا کریں اور ہم اس کام میں عاجز ہونے والے نہیں ہیں)۔

'مشرقین' اور 'مغربین' کے مثنیٰ لانے کی توجیہ عام طور پر ہمارے مفسرین نے یہ کی ہے کہ اس سے سردی اور گرمی کے مشرق و مغرب مراد ہیں لیکن یہ محض تکلف ہے۔ قرآن میں یہ الفاظ واحد، تثنیہ، جمع تینوں صورتوں

میں استعمال ہوئے ہیں اور ان تینوں ہی صورتوں میں مفہوم کے اعتبار سے کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ مثنیٰ کی صورت میں مقصود ان کے دونوں اطراف کا احاطہ ہوتا ہے اور جمع کی شکل میں ان کے اطراف واکناف کی بے نہایت وسعت کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔ مثنیٰ اور جمع کے اس نوع کے استعمال کی مثالیں اس کتاب میں پیچھے گزر چکی ہیں۔

اس کے بعد وہی ترجیع ہے جو اوپر گزر چکی ہے یعنی جس خدا کی عظمت و شان کا حال یہ ہے کہ مشرق و مغرب سب اس کے زیر نگیں ہیں، اگر اس کے انذار کو سمجھتے ہو کہ یہ ڈراوے محض ہوائی ہیں تو آخر اس کی کن کن عظمتوں کی تکذیب کرو گے!

مَرَجَ الْبَحْرَیْنِ یَلْتَقِیٰنِ ۝ بَیْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا یَبْغِیٰنِ ۝ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (۱۹-۲۱)

توحید کی دلیل اضداد کے توافق کے پہلو سے

یہ اوپر کے دعوائے توحید کی دلیل اس کائنات کے اضداد میں توافق کے پہلو سے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس کائنات کے ہر گوشے میں بظاہر جو تضاد نظر آتا ہے، طلوع کے ساتھ غروب، دن کے ساتھ رات، اور سردی کے مقابل میں گرمی ہے تو اس سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ اس کے اندر مختلف ارادے اور مشیتیں کارفرما ہیں۔ انسان اگر اس کی تہ میں جھانک کر دیکھے تو معلوم ہوگا کہ اس کے ہر تضاد کے اندر نہایت گہرا توافق اور نہایت عمیق سازگاری ہے۔ ہر چیز اپنے مقابل کے ساتھ مل کر ایک بالاتر مقصد کی خدمت میں لگی ہوئی ہے جو اس بات کی شہادت ہے کہ درحقیقت ایک ہی ارادہ اس تمام کائنات پر حکمران ہے جو اس کے تمام اضداد کو اپنی حکمت کے تحت کائنات کے مجموعی مفاد کے لیے استعمال کر رہا ہے۔ فرمایا کہ دیکھو، وہ دو دریاؤں کو چھوڑتا ہے، ایک کھاری ہوتا ہے، دوسرا شیریں، دونوں آپس میں ٹکراتے ہیں لیکن خدائے قادر و حکیم دونوں کے درمیان ایک ایسا غیر مرئی پردہ ڈال دیتا ہے کہ وہ دونوں ملتے بھی ہیں اور الگ الگ اپنے مزاج پر قائم بھی رہتے ہیں۔ یہ نہیں ہوتا کہ کھاری دریا شیریں یا شیریں دریا کھاری بن جائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ ظاہری تضاد کو دیکھ کر اس مغالطہ میں پڑ گئے کہ اس کے اندر متضاد ارادے کارفرما ہیں اور پھر انھوں نے اپنے اپنے تصور کے مطابق اپنے الگ الگ دیوتا بنا لیے ان کی نظر اس توافق پر نہیں پڑی جو ہر تضاد کے اندر موجود ہے اور جو توحید کی سب سے بڑی حجت ہے۔

آخر میں وہی ترجیع ہے جو اوپر گزر چکی ہے۔ یعنی ان روشن شواہد کے بعد بھی اگر اس مغالطہ میں مبتلا ہو کر خدا نے تم کو پکڑا تو تمھارے دیوی دیوتا تم کو بچا لیں گے، تو آخر اپنے رب کی کن کن نشانیوں کو جھٹلاؤ گے۔

یَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ ۝ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (۲۲-۲۳)

یہ ایک مشترک مجموعی فائدہ کی طرف اشارہ ہے جو باوصف تضاد ان سے حاصل ہوتا ہے کہ ان دونوں ہی سے موتی اور مونگے حاصل ہوتے ہیں جو انسان کے لیے دولت بھی ہیں اور زینت بھی۔

بعض مفسرین نے یہاں یہ سوال اٹھایا ہے کہ مونگے اور موتی تو صرف کھاری پانی سے نکلتے ہیں اور قرآن کا بیان یہ ہے کہ دونوں سے نکلتے ہیں تو اس کا جواب کیا ہے؟ ہمارے نزدیک اس کا جواب یہ ہے کہ یہ دعویٰ بالکل بے بنیاد ہے کہ موتی صرف کھاری پانی سے نکلتے ہیں۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (ENCYCLOPAEDIA BRITANNICA) میں موتی پر جو مضمون ہے اس کا ایک ضروری اقتباس ہم یہاں درج کرتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مونگے اور موتی میٹھے پانی سے بھی نکلتے ہیں۔ مضمون نگار لکھتا ہے:

بعض مفسرین کا ایک غلط دعویٰ

"نصف کرۂ شمالی کے منطقہ معتدلہ میں میٹھے پانی کے سیپ کے کیڑے (FRESH WATERS MUSSELS) بہت قیمتی موتی پیدا کرتے رہے ہیں۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ کے میٹھے پانی کے موتی زیادہ تر دریائے مس سس پی (MISSISSIPPI RIVER) سے نکلتے ہیں۔ برطانیہ میں موتی نکالنے کی صنعت اب زوال پر ہے، لیکن سکاٹ لینڈ کے دریاؤں، سپے (SPEY) اور طے (TAY) اور شمالی ویلز کے دریا کان وے (CONWAY) سے نکلنے والے موتیوں کی ایک زمانے میں بہت مانگ رہی ہے۔ چین میں میٹھے پانی سے موتی نکالنے کی صنعت ہزار برس قبل مسیح سے معروف ہے۔"[1]

اور بالفرض کھاری پانی ہی سے نکلتے ہوں جب بھی اس سے قرآن کے بیان پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ قانونِ قدرت یہ ہے کہ اشیاء تضادات کے ملاپ سے پیدا ہوتی ہیں۔ بچہ مرد اور عورت کے ملاپ سے پیدا ہوتا ہے، وہ پرورش اگرچہ ماں کے پیٹ میں پاتا ہے لیکن حقیقت یہی ہے کہ وہ عورت اور مرد، دونوں سے وجود میں آتا ہے۔ اسی طرح موتی شیریں اور کھاری، دونوں ہی پانیوں کے ملاپ سے پیدا ہوتے ہیں اگرچہ وہ پرورش کھاری پانی ہی کے اندر پاتے ہوں۔

اس کے بعد وہی ترجیع ہے جو اوپر گزر چکی ہے اور اس کا موقع و محل بالکل واضح ہے۔

وَلَهُ الْجَوَارِ الْمُنْشَآتُ فِي الْبَحْرِ كَالْأَعْلَامِ ۚ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ (۲۴-۲۵)

تضاد کے اندر توافق کی ایک اور نشانی

تضاد کے باوصف توافق کی ایک اور نشانی کی طرف توجہ دلائی کہ یہ بھی خدا ہی کی قدرت کا کرشمہ ہے کہ پہاڑوں کی طرح اونچے اور بھاری بھاری جہاز سمندروں کے سینے پر دوڑتے پھرتے ہیں۔ حالانکہ کوئی وزن رکھنے والی چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی پانی کے اندر ڈالیے تو ڈوب جاتی ہے لیکن یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت و حکمت کی کارسازی ہے کہ جہاز جیسی بھاری چیز، ہزاروں ٹن سامان اپنے اوپر لادے ہوئے، پانی کو چیرتی ہوئی چلتی اور ڈوبنے سے محفوظ رہتی ہے۔ 'لَہٗ' سے مطلب یہاں یہ ہے کہ تضادات کے اندر اس قسم کی موافقت و سازگاری پیدا کرنا صرف اللہ وحدہٗ لاشریک ہی کے اختیار میں ہے۔ صرف اسی کی قدرت و حکمت سے ایسے کرشمے ظہور میں آتے ہیں اور تم ہر جگہ یہ دیکھ رہے ہو تو اپنے رب کے کن کن کرشموں کو

---

[1] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا مضمون: PEARL

جھٹلاؤ گے! یہ مضمون سورۂ فاطر میں اس طرح بیان ہوا ہے:

وَمَا يَسْتَوِي الْبَحْرَانِ ۖ هَٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ سَائِغٌ شَرَابُهُ وَهَٰذَا مِلْحٌ أُجَاجٌ ۖ وَمِن كُلٍّ تَأْكُلُونَ لَحْمًا طَرِيًّا وَتَسْتَخْرِجُونَ حِلْيَةً تَلْبَسُونَهَا ۖ وَتَرَى الْفُلْكَ فِيهِ مَوَاخِرَ لِتَبْتَغُوا مِن فَضْلِهِ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ (فاطر: ۱۲)	اور دونوں دریا یکساں نہیں ہوتے۔ ایک شیریں اور خالص، جس کا پانی پینے کے لیے خوش گوار ہوتا ہے اور دوسرا کھاری تلخ۔ اور ان دونوں ہی سے تم تازہ گوشت بھی کھاتے ہو اور آرائش کے سامان بھی نکالتے ہو جن کو پہنتے ہو۔ اور کشتیوں کو دیکھتے ہو کہ ان میں پھاڑتی ہوئی چلتی ہیں تاکہ تم اس کا فضل چاہو اور تاکہ اس کے شکر گزار بنو۔

سورۂ شوریٰ کی آیات کے تحت بھی یہ مضمون بیان ہو چکا ہے۔ مزید تفصیل مطلوب ہو تو ایک نظر اس پر بھی ڈال لیجیے۔

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۝ وَيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ ۝ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ (۲۶-۲۸)

مذکورہ بالا دلائل کا لازمی نتیجہ

ضمیر مجرور کا مرجع 'الارض' (زمین) ہے جس کا ذکر اوپر آیت ۱۰ سے چلا آ رہا ہے۔ زمین کے اندر اللہ تعالیٰ نے انسان کی پرورش کا جو سامان کیا ہے، اس کی خلقت میں اپنی جو شانیں اور حکمتیں دکھائی ہیں، اس کے ہر گوشے پر جس طرح اس کا اقتدار محیط ہے اور اس کے اضداد کے باہمی توافق سے جس طرح اس کے خالق کی یکتائی نمایاں ہو رہی ہے، یہ باتیں متلازم ہیں کہ ایک دن یہ ساری چیزیں فنا ہو جائیں گی، صرف اللہ تعالیٰ کی باعظمت اور سزاوارِ تعظیم ذات ہی باقی رہ جائے گی، جس کے حضور سب کی پیشی ہونی ہے اور وہ ہر ایک کے ساتھ وہی معاملہ کرے گا جس کا وہ سزاوار ہو گا، کسی کی مجال نہیں ہو گی کہ اس کے آگے دم مار سکے یا اس کے اذن کے بغیر کسی کی سفارش کے لیے زبان کھول سکے۔

'ذِی الْجَلٰلِ وَالْاِکْرَامِ' کے الفاظ اس سورہ کی آخری آیت میں بھی آئے ہیں۔ مقصود ان دونوں لفظوں کے لانے سے یہ ہے کہ درحقیقت وہی اپنی ذات میں باعظمت ہے اس وجہ سے وہی سب کی تعظیم و تکریم کا حقیقی سزاوار ہے۔ کوئی اور ان اوصاف میں اس کا شریک نہیں ہے۔ لفظ 'وجہ' یہاں اس کی ذات کی تعبیر کے لیے آیا ہے۔ چہرہ ذات کا سب سے اشرف حصہ ہے اس وجہ سے بعض اوقات اس سے پوری ذات کو تعبیر کر دیتے ہیں۔

آخر میں آیتِ ترجیع ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ تم پیغمبر کے انذار کو سنو یا نہ سنو لیکن بالآخر یہ بات ہو کے رہے گی کہ ایک دن سب فنا ہو جائیں گے، صرف اللہ جلّ شانہٗ کی ذات ہی باقی رہے گی تو تم اپنے رب کی کن کن نشانیوں کو جھٹلاؤ گے!

يَسْـَٔلُهٗ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِىْ شَاْنٍ ۚ فَبِاَىِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ (۲۹-۳۰)

حقیقی مرجع اللہ ہی ہے

یعنی سب کا مرجع حقیقی وہی ہے۔ جو بھی پاتا ہے اسی کا دیا ہوا پاتا ہے۔ لفظ 'سوال' یہاں اپنے ثمر اور نتیجہ کے اعتبار سے استعمال ہوا ہے۔ یعنی ہر مانگنے والا چونکہ پاتا اسی سے ہے اس وجہ سے خواہ کسی سے مانگے لیکن حقیقت کے اعتبار سے اسی سے مانگتا ہے۔ دوسروں سے اس کا مانگنا بالکل بے سود اور لاحاصل ہے۔ کوئی دوسرا نہ کچھ دے سکتا نہ کچھ لے سکتا۔ اس وجہ سے کسی اور کو مولیٰ و مرجع سمجھ کر اس کے آگے اپنی التجا و درخواست پیش کرنا محض سفاہت ہے۔ دنیا میں انسان کو جو کچھ ملتا ہے خدا ہی کا دیا ہوا ملتا ہے اور آخرت میں بھی جو کچھ ملے گا اسی کا دیا ہوا ملے گا۔

یہ لفظ احتیاج کے معنی میں بھی آتا ہے۔ مثلاً سورہ 'حٰمٓ السجدۃ' میں ہے: 'سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ' (۱۰) (تمام ضرورت مندوں کے لیے یکساں) یہ معنی لیے جائیں تو آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہیں سب اسی کے محتاج ہیں۔

کائنات کا سارا انتظام اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے

'كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِىْ شَاْنٍ'۔ یعنی اس مغالطہ میں نہ رہو کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو پیدا کر کے اس کا انتظام و انصرام تمہارے فرضی دیویوں دیوتاؤں کے سپرد کر دیا ہے اور خود بالکل معطل ہو کر کسی گوشۂ تنہائی میں جا بیٹھا ہے۔ جو لوگ اس مغالطہ میں ہیں وہ خدا کی شانوں سے بالکل بے خبر ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنی اس کائنات کا سارا انتظام خود سنبھالے ہوئے ہے۔ وہی آسمانوں میں سورج اور چاند کو حرکت دیتا ہے اور وہی زمین میں اپنے بندوں کی ضروریات پوری کرتا ہے اس وجہ سے اس کا ہر لمحہ کسی نہ کسی کام میں ہے۔ 'یوم' یہاں وقت کے مفہوم میں ہے اور قرآن میں یہ لفظ اس مفہوم میں جگہ جگہ استعمال ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ اس دنیا کا انتظام خود سنبھالے ہوئے ہے تو کسی اور وسیلہ و واسطہ کی ضرورت کہاں باقی رہی؟ پھر تو جس کو جو کچھ مانگنا ہو اسی سے مانگے۔

اس کے بعد آیت ترجیع ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی گوشۂ خلوت میں نہیں بیٹھا ہوا ہے بلکہ وہ ہر وقت اپنی دنیا کے انتظام و انصرام میں لگا ہوا ہے اور اس کی شانیں اس کائنات کے گوشہ گوشہ سے نمایاں ہیں تو اس کی کن کن شانوں کو جھٹلاؤ گے۔

۲۔ آگے آیات ۳۱-۴۵ کا مضمون

آگے اس دن کی تصویر آ رہی ہے جس سے لوگوں کو ڈرایا جا رہا ہے۔ نظم کلام بالکل واضح ہے۔ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۳۱-۴۵

سَنَفْرُغُ لَكُمْ اَيُّهَ الثَّقَلٰنِ ﴿۳۱﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۳۲﴾
يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا ؕ لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ ﴿۳۳﴾ فَبِاَيِّ
اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۳۴﴾ يُرْسَلُ عَلَيْكُمَا شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ ۙ وَّ
نُحَاسٌ فَلَا تَنْتَصِرٰنِ ﴿۳۵﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۳۶﴾ فَاِذَا انْشَقَّتِ
السَّمَآءُ فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ ﴿۳۷﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا
تُكَذِّبٰنِ ﴿۳۸﴾ فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُسْئَلُ عَنْ ذَنْۢبِهٖۤ اِنْسٌ وَّلَا جَآنٌّ ﴿۳۹﴾
فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۴۰﴾ يُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِيْمٰهُمْ فَيُؤْخَذُ
بِالنَّوَاصِيْ وَالْاَقْدَامِ ﴿۴۱﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۴۲﴾ هٰذِهٖ
جَهَنَّمُ الَّتِيْ يُكَذِّبُ بِهَا الْمُجْرِمُوْنَ ۘ ﴿۴۳﴾ يَطُوْفُوْنَ بَيْنَهَا
وَبَيْنَ حَمِيْمٍ اٰنٍ ﴿۴۴﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۴۵﴾

ع ۲ / ۱۲

ترجمۂ آیات ۳۱-۴۵

ہم تمہارے لیے فارغ ہی ہو رہے ہیں، اے دونو جھتو! تو تم اپنے رب کی کن کن شانوں کو جھٹلاؤ گے! اے جنوں اور انسانوں کے گروہ، اگر تم یہ کر سکو کہ نکل بھاگو آسمانوں اور زمین کے اطراف سے تو نکل بھاگو، تم پروانۂ راہداری کے بدون نہیں نکل سکو گے۔ تو تم اپنے رب کے کن کن اختیارات کو جھٹلاؤ گے! تم پر مارے جائیں گے آگ کے شعلے اور تانبے! تو تم اپنا بچاؤ نہ کر پاؤ گے۔ تو تم اپنے رب کی کن کن قدرتوں کو جھٹلاؤ گے! ۳۱-۳۶

پس یاد رکھو اس وقت کو جب آسمان پھٹ کر کھال کی مانند سرخ ہو جائے گا تو تم اپنے رب کے کن کن کرشموں کو جھٹلاؤ گے! پس اس دن کسی انسان یا جن سے اس کے گناہ کی

بابت سوال کی ضرورت نہیں ہوگی، تو تم اپنے رب کی کن کن شانوں کو جھٹلاؤ گے! مجرم پہچان لیے جائیں گے اپنی علامتوں سے پس پکڑے جائیں گے چٹیا اور پاؤں سے (اور جہنم میں پھینک دیے جائیں گے) تو اپنے رب کی کن کن قدرتوں کی تکذیب کرو گے! یہ ہے وہ جہنم جس کی مجرم تکذیب کرتے رہے تھے۔ وہ اس کے اور اس کے کھولتے پانی کے درمیان چکر لگاتے ہوں گے تو اپنے رب کی کن کن شانوں کو جھٹلاؤ گے! ۴۷-۴۵

۲- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

سَنَفْرُغُ لَكُمْ اَيُّهَ الثَّقَلٰنِ ۚ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ (۳۱-۳۲)

جزاء و سزا کی وعید

'ثقلان' سے مراد جن و انس، دونوں من حیث الجماعت ہیں۔ جماعتی حیثیت میں چونکہ دونوں بھاری بھرکم بن جاتے ہیں اس وجہ سے 'ثقلان' کا لفظ استعمال ہوا۔ اس لفظ کے استعمال سے اس چیلنج کی سنگینی واضح ہوتی ہے جو اس آیت میں جنوں اور انسانوں دونوں گروہوں کو بیک وقت دیا گیا ہے، مطلب یہ نکلا کہ خواہ تم کتنے ہی بھاری لشکر ہو لیکن اللہ جل شانہٗ، تم سے تنہا نمٹنے کے لیے عنقریب فارغ ہوا چاہتا ہے۔ فارغ ہونے سے اشارہ اس حقیقت کی طرف ہے کہ ابھی تو اس دنیا کا کارخانہ چل رہا ہے اور اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا یہی ہے کہ یہ اپنی مدت پوری کرے لیکن وہ وقت دور نہیں ہے جب یہ مدت پوری ہو جائے گی۔ اس وقت اللہ تعالیٰ اس دنیا کے نظم و نسق سے بالکل فارغ ہو کر بندوں کے حساب کتاب کی طرف متوجہ ہوگا اور ایک ایک کا حساب کر کے جس کو جس جزا یا سزا کا سزاوار پائے گا اس کو وہ دے گا۔ اس اسلوب بیان سے یہ مضمون بھی نکلا کہ یہ کام اللہ تعالیٰ سرسری طور پر نہیں بلکہ پوری یکسوئی سے کرے گا۔ اس لیے کہ یہی کام درحقیقت اس دنیا کے پیدا کرنے کی اصل غایت ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو یہ دنیا بالکل بے مقصد بن کے رہ جاتی ہے۔

اس کے بعد آیت ترجیع ہے۔ یہاں اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس دنیا میں جو واضح دلیلیں تمہارے سامنے جزاء و سزا کے حق ہونے کی پیش کی گئیں وہ تو تم نے رد کر دیں لیکن اس وقت کیا کرو گے جب دیکھو گے کہ فی الواقع روزِ حساب آ گیا اور اللہ تعالیٰ کی عدالت قائم ہو گئی؟ کیا اس وقت بھی جھٹلاؤ گے؟ اگر جھٹلاؤ گے تو آخر اپنے رب کی کتنی نشانیوں کو جھٹلاؤ گے؟

يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

فَانْفُذُوْا لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ ۝ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ (۳۳-۳۴)

کوئی چیز خدا کی گرفت سے باہر نہیں ہے

یعنی اگر تمھارا گمان ہے کہ تم بالکل غیر مسئول اور مطلق العنان ہو تو ذرا اللہ کے بنائے ہوئے آسمانوں اور اس کی پیدا کی ہوئی زمین کے حدود سے باہر نکل کر دکھاؤ تاکہ ثابت ہو جائے کہ تم اس کی گرفت سے آزاد ہو یا ہو سکتے ہو۔

'لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ'۔ لفظ 'سُلْطٰن' اختیار و اقتدار کے معنی میں بھی آتا ہے اور سند کے معنی میں بھی۔ یہاں یہ اس دوسرے معنی میں ہے۔ یعنی تم لاکھ چاہو لیکن آسمانوں اور زمین کے حدود سے باہر نہیں نکل سکتے۔ یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب تمھارے پاس پاسپورٹ ہو۔ اور یہ چیز ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور تمھیں نہیں دے سکتا۔

آگے آیت ترجیع ہے۔ یہاں اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اگر تمھاری بے اختیاری و بے بسی کی یہ دلیل بھی تمھاری سمجھ میں نہیں آئی تو آخر اپنے رب کی کن کن قدرتوں اور شانوں کو جھٹلاتے رہوگے۔

يُرْسَلُ عَلَيْكُمَا شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ ۙ وَّنُحَاسٌ فَلَا تَنْتَصِرٰنِ ۝ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ (۳۵-۳۶)

یعنی اگر تم میں سے کوئی اللہ تعالیٰ کے مقررہ حدود سے باہر نکلنے کی کوشش کرے گا تو اس پر آگ کے شعلوں اور پگھلے ہوئے تانبے کی مار پڑے گی اور وہ ایسی بے پناہ ہوگی کہ تم میں سے کوئی بھی اس سے اپنا بچاؤ نہیں کر سکے گا۔

'شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ' سے مراد شہاب ثاقب ہیں جن کے متعلق قرآن مجید میں تصریح ہے کہ یہ ان شیاطین الجن پر پھینکے جاتے ہیں جو ملاء اعلیٰ کے حدود میں دراندازی اور غیب کی باتوں کی ٹوہ لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ قرآن میں خود جنوں کی زبان سے اس امر واقعی کا اعتراف یوں نقل ہوا ہے: 'وَّاَنَّا ظَنَنَّآ اَنْ لَّنْ نُّعْجِزَ اللّٰهَ فِي الْاَرْضِ وَلَنْ نُّعْجِزَهٗ هَرَبًا' (الجن: ۱۲) (اور ہم نے اچھی طرح اندازہ کر لیا ہے کہ نہ ہم زمین میں چھپ کر اللہ کی گرفت سے بچ سکتے ہیں نہ آسمانوں میں بھاگ کر اس سے نکل سکتے)۔

مفسرین کی ایک غلط فہمی

'نُحَاس' کے معنی عام طور پر ہمارے مفسرین و مترجمین نے دھوئیں کے لیے ہیں لیکن یہ لفظ اس معنی میں معروف نہیں ہے۔ بعض اہل لغت نے اگرچہ ایک شاذ معنی کی حیثیت سے اس کا ذکر کیا ہے اور نابغہ کے ایک شعر کا بھی حوالہ دیا ہے لیکن اول تو وہ شعر محل نظر ہے دوسرے یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ دھوئیں کے لیے معروف لفظ 'دُخَان' چھوڑ کر، جو قرآن میں بھی استعمال ہوا ہے، ایک غیر معروف لفظ لانے کی وجہ کیا ہے جب کہ قرآن عربی مبین میں نازل ہوا ہے۔ اس وجہ سے ہم کو 'نحاس' کے یہ معنی قبول کرنے میں تردد ہے۔ ہمارے نزدیک یہ اپنے معروف معنی ہی میں استعمال ہوا ہے اور یہ انہی شہابوں کی ایک قسم ہے جن کا ذکر 'شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ' کے الفاظ سے ہوا ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ سائنس کی تحقیقات سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ بیشتر شہابیے تو گرتے ہی فضا میں تحلیل ہو جاتے ہیں۔ یہ بڑے بڑے فلزاتی اور حجری گولوں کی شکل میں گرتے ہیں لیکن اشیاء کی حرکی توانائی (KINETIC ENERGY) غلافِ جوّی میں داخل ہوتے ہی زیادہ تر حرارت میں تبدیل ہو جاتی ہے جس سے شہاب پگھل کر آگ کے گولوں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور زمین کی طرف گرنے کے دوران ان کا فلزاتی اور حجری مادہ بڑی حد تک ضائع ہو جاتا یا عملِ تبخیر اسے غبار کی شکل میں تبدیل کر دیتا ہے۔ تاہم جو شہاب زمین پر پائے گئے ہیں ان کو تین گروپوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

۱- فلزاتی شہاب (SIDERITES)

۲- حجری شہاب (AEROLITES)

۳- حجری۔ فلزاتی شہاب (SIDEROLITES)

ان شہابوں کے اندر جس طرح لوہے اور پتھر کے اجزاء پائے گئے ہیں اسی طرح تحقیق سے ان کے اندر کانسی اور تانبے کے اجزاء بھی پائے گئے ہیں جن کا آیت زیرِ بحث میں 'نحاس' کے لفظ سے ذکر آیا ہے یہ فلزاتی اجزاء زیادہ تر شدتِ حرارت سے تحلیل ہو جانے والے ہیں تاہم زمین پر گرنے والوں شہابوں میں ان کا پایا جانا قرآن کی بات کی تصدیق کرتا ہے[۱]

فَاِذَا انْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ ۚ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ (۳۷-۳۸)

'دھان' کے معنی

'دِھَان' کے معنی لوگوں نے تیل کے تلچھٹ کے بھی لیے ہیں لیکن یہ لفظ کھال کے معنی میں بھی معروف ہے۔ سرخی کی تشبیہ کے لیے کھال زیادہ موزوں ہے اس وجہ سے ہم نے اسی معنی کو ترجیح دی ہے۔ دوسرے مقام میں 'وَاِذَا السَّمَآءُ كُشِطَتْ' (التکویر-۱۱) بھی آیا ہے جس کے معنی ہیں جب کہ آسمان کی کھال کھینچ لی جائے گی یعنی جس طرح کھال کھینچ لینے کے بعد جسم کا گوشت سرخ سرخ نظر آتا ہے اسی طرح آسمان بھی سرخ نظر آئے گا۔ یہاں اس کی سرخی کو سرخ کھال سے تشبیہ دی ہے اور یہ تشبیہ نہایت موزوں ہے۔ یہ روزِ قیامت کے ظہور کی تصویر ہے کہ آج تو تم بڑی ڈھٹائی سے قیامت کا انکار کر رہے ہو لیکن وہ دن بھی آنے والا ہے جب آسمان شق ہو جائے گا اور یہ نیلگوں چھت سرخ کھال کی طرح نظر آئے گی۔ مطلب یہ ہے کہ اس وقت کیا کرو گے، کیا اس وقت بھی انکار کرو گے، آخر اپنے رب کی کن کن شانوں کو جھٹلاؤ گے، اس کے عجائباتِ قدرت تو یکے بعد دیگرے ظاہر ہی ہوتے رہیں گے۔

---

[۱] شہابوں سے متعلق یہ تحقیق انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں فہرست شہب (CATALOGUE OF METEORITES) کے مصنف (MAX H. HEY) کے مضمون 'شہابِ ثاقب' سے ماخوذ ہے۔

فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُسْـَٔلُ عَن ذَنۢبِهِۦٓ إِنسٌ وَلَا جَآنٌّ ۝ فَبِأَيِّ ءَالَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ۝ يُعْرَفُ ٱلْمُجْرِمُونَ بِسِيمَٰهُمْ فَيُؤْخَذُ بِٱلنَّوَٰصِى وَٱلْأَقْدَامِ ۝ فَبِأَيِّ ءَالَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ (۳۹-۴۲)

مجرموں کا جرم بے تحقیق واضح ہوگا

یعنی اس مغالطے میں نہ رہو کہ اس دن تمھارے جرائم کی تفتیش و تحقیق کے لیے اللہ تعالیٰ اور اس کے ملائکہ کو کوئی محنت کرنی پڑے گی۔ محنت تو درکنار کسی سے اس کے جرم کی بابت پوچھنے کی بھی ضرورت نہیں پیش آئے گی۔ اس دن ہر مجرم اپنی پیشانی سے پہچان لیا جائے گا کہ وہ کس درجے کا مجرم اور کس سزا کا مستحق ہے۔

سوال کی مختلف نوعیتیں ہوتی ہیں۔ یہاں جس سوال کی نفی ہے وہ تحقیق و تفتیش کی نوعیت کا سوال ہے۔ اس کی ضرورت پیش نہ آنے کی وجہ قرآن کے دوسرے مقامات میں یہ بیان ہوئی ہے کہ اس دن آدمی کے صرف ہاتھ پاؤں ہی نہیں بلکہ اس کے ایک ایک بن مو سے اس کے جرائم کی شہادت ملے گی۔ رہا وہ سوال جو توبیخ یا ملامت یا استہزاء اور طنز کی نوعیت کا ہوتا ہے تو اس کی نفی یہاں نہیں کی گئی ہے اور قرآن میں جو سوالات مجرموں سے مذکور ہیں وہ اسی دوسری نوعیت کے ہیں۔ اس باب میں قرآن کے بیان میں کوئی تضاد نہیں ہے بلکہ دونوں کے مواقع الگ الگ ہیں۔

دوزخ میں پھینکے جانے کی تصویر

'فَيُؤْخَذُ بِٱلنَّوَٰصِى وَٱلْأَقْدَامِ' یہ ان کے دوزخ میں پھینکے جانے کی تصویر ہے کہ اپنے جرم کی علامت کے ساتھ یہ دوزخ کے سنتریوں کے پاس لائے جائیں گے اور وہ ان کی چٹیا اور ان کے پاؤں پکڑ کے اٹھائیں گے اور جس طرح لکڑی کے کندے دہکتی آگ میں پھینکے جاتے ہیں اسی طرح ان کو بھڑکتی دوزخ میں پھینک دیں گے۔ یہاں دوزخ میں پھینکے جانے کا مضمون محذوف ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے پکڑے جانے کی جو تصویر کھینچی گئی ہے وہ پھینکے جانے ہی کی ہے۔ اس واضح قرینہ کی موجودگی میں اس مضمون کے اظہار کی ضرورت نہیں تھی۔

آگے آیت ترجیع ہے اور اس کا موقع و محل بالکل واضح ہے کہ تمھارے سامنے مرحلہ تو یہ بھی آنے والا ہے تو آخر اپنے رب کی کن کن نشانیوں کی تکذیب کرو گے!

هَٰذِهِۦ جَهَنَّمُ ٱلَّتِى يُكَذِّبُ بِهَا ٱلْمُجْرِمُونَ ۝ يَطُوفُونَ بَيْنَهَا وَبَيْنَ حَمِيمٍ ءَانٍ ۝ فَبِأَيِّ ءَالَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ (۴۳-۴۵)

آگ اور کھولتے پانی کے درمیان گردش

فرمایا کہ یہ ہے اس جہنم کی تصویر جس کی مجرمین تکذیب کر رہے ہیں بالآخر وہ اس کی آگ اور اس کے کھولتے پانی کے درمیان پھیرے لگائیں گے۔ 'آنٍ' اس پانی کی صفت کے لیے آتا ہے جس کی گرمی اپنے آخری نقطہ پر پہنچی ہوئی ہو۔ یہ ان کی انتہائی بے کسی کی تصویر ہے کہ جب دوزخ کی آگ ان کو جھلسے گی تو وہ پانی کی تلاش میں بھاگیں گے لیکن پانی کا حال یہ ہوگا کہ وہ گرمی کے آخری نقطہ پر پہنچا ہوا ہوگا۔ انہی کے درمیان پھیرے لگانے میں ان کی زندگی گزرے گی۔ سورۂ غاشیہ میں ان کی اس حالت کی تصویر یوں کھینچی گئی ہے: تَصْلَىٰ نَارًا حَامِيَةً ۝ تُسْقَىٰ مِنْ عَيْنٍ ءَانِيَةٍ (الغاشیۃ ۴-۵) (وہ بھڑکتی آگ میں داخل ہوں گے

اور جب پانی مانگیں گے تو ان کو آخری درجے میں گرم چشمہ کا پانی پلایا جائے گا)۔
آخر میں آیتِ ترجیع ہے اور اس کا موقع و محل واضح ہے کہ آج تو بڑی ڈھٹائی سے آخرت اور عذاب کا انکار کر رہے ہو لیکن جب یہ کچھ سامنے آئے گا تب کیا کرو گے! آخر اپنے رب کے کتنے مظاہر کو جھٹلاؤ گے!

۴- آگے آیات ۴۶-۷۸ کا مضمون

مجرموں کا انجام بیان کرنے کے بعد آگے اس صلہ کی تفصیل ہے جو اللہ سے ڈرتے رہنے والوں کو قیامت میں ملنے والا ہے۔ اس تقابل سے دونوں گروہوں کی پوری تصویر سامنے آگئی ہے۔ نظمِ کلام بالکل واضح ہے۔ بس اتنی بات یاد رکھنے کی ہے کہ آیات ۴۶-۶۱ میں مقربین کی حیثیت کا بیان ہے اور اس کے بعد کی آیات میں اصحاب الیمین کی جنت کا۔ ان دونوں گروہوں کے فرقِ مراتب کی تفصیل اس کے بعد والی سورہ —— الواقعۃ —— میں آئے گی جو اس کی توام سورہ ہے —— اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۴۶-۷۸

وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ ﴿٤٦﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٤٧﴾ ذَوَاتَاۤ اَفْنَانٍ ﴿٤٨﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٤٩﴾ فِیْهِمَا عَیْنٰنِ تَجْرِیٰنِ ﴿٥٠﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٥١﴾ فِیْهِمَا مِنْ كُلِّ فَاكِهَةٍ زَوْجٰنِ ﴿٥٢﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٥٣﴾ مُتَّكِـِٕیْنَ عَلٰی فُرُشٍۭ بَطَآىِٕنُهَا مِنْ اِسْتَبْرَقٍ ؕ وَجَنَا الْجَنَّتَیْنِ دَانٍ ﴿٥٤﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٥٥﴾ فِیْهِنَّ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ ۙ لَمْ یَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَآنٌّ ﴿٥٦﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٥٧﴾ كَاَنَّهُنَّ الْیَاقُوْتُ وَالْمَرْجَانُ ﴿٥٨﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٥٩﴾ هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ ﴿٦٠﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٦١﴾ وَمِنْ دُوْنِهِمَا جَنَّتٰنِ ﴿٦٢﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٦٣﴾ مُدْهَآمَّتٰنِ ﴿٦٤﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٦٥﴾ فِیْهِمَا عَیْنٰنِ نَضَّاخَتٰنِ ﴿٦٦﴾

فَبِاَيِّ اٰلَاۤءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۶۷﴾ فِيْهِمَا فَاكِهَةٌ وَّنَخْلٌ وَّرُمَّانٌ ﴿۶۸﴾
فَبِاَيِّ اٰلَاۤءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۶۹﴾ فِيْهِنَّ خَيْرٰتٌ حِسَانٌ ﴿۷۰﴾
فَبِاَيِّ اٰلَاۤءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۷۱﴾ حُوْرٌ مَّقْصُوْرٰتٌ فِي الْخِيَامِ ﴿۷۲﴾
فَبِاَيِّ اٰلَاۤءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۷۳﴾ لَمْ يَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ
وَلَا جَاۤنٌّ ﴿۷۴﴾ فَبِاَيِّ اٰلَاۤءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۷۵﴾ مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰى
رَفْرَفٍ خُضْرٍ وَّعَبْقَرِيٍّ حِسَانٍ ﴿۷۶﴾ فَبِاَيِّ اٰلَاۤءِ رَبِّكُمَا
تُكَذِّبٰنِ ﴿۷۷﴾ تَبٰرَكَ اسْمُ رَبِّكَ ذِي الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ﴿۷۸﴾

ع ۳ ۲۲ ۱۴

ترجمۂ آیات ۴۶ سے

اور ان کے لیے جو اپنے رب کے حضور پیشی سے ڈرتے رہے دو باغ ہوں گے۔
تو تم اپنے رب کی کن کن عنایتوں کو جھٹلاؤ گے! دونوں نہایت کثیر شاخوں والے ہوں گے
تو تم اپنے رب کی کتنی رحمتوں کو جھٹلاؤ گے! ان کے اندر دو چشمے جاری ہوں گے۔ تو تم اپنے
رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے! ان میں ہر میوے کی الگ الگ قسمیں ہوں گی تو تم اپنے
رب کے کن کن افضال کی تکذیب کرو گے! وہ ٹیک لگائے ایسے بچھونوں پر بیٹھے ہوں گے
جن کے استر استبرق کے ہوں گے اور دونوں باغوں کے پھل ان کے سروں پر لٹک رہے ہوں گے
تو اپنے رب کی کتنی نعمتوں کی تکذیب کرو گے! ان میں باحیا حوریں ہوں گی جن کو ان سے پہلے
کسی انسان یا جن نے ہاتھ نہیں لگایا ہوگا۔ تو تم اپنے رب کی کتنی نوازشوں کو جھٹلاؤ گے!
وہ حوریں ایسی ہوں گی گویا یاقوت اور مونگے ہوں تو تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے!
نیکی کا صلہ تو آخر احسان ہی ہوگا! تو تم اپنے رب کے کن کن احسانوں کو جھٹلاؤ گے! ۴۶ - ۶۱
اور ان دو کے سوا اور بھی دو باغ ہوں گے تو تم اپنے رب کی کتنی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے!

دونوں سبزی سے سیاہی مائل، تو اپنے رب کی کن کن رحمتوں کو جھٹلاؤ گے! ان میں دو چشمے ہوں گے اُبلتے ہوئے تو اپنے رب کی کتنی رحمتوں کو جھٹلاؤ گے! ان میں میوے، کھجور اور انار ہوں گے تو تم اپنے رب کی کتنی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے! ان میں نیک سیرت اور خوب صورت حوریں ہوں گی تو اپنے رب کی کتنی عنایتوں کی تکذیب کرو گے! حوریں، خیموں میں رہنے والیاں، تو اپنے رب کے کتنے احسانات کو جھٹلاؤ گے! ان سے پہلے ان کو نہ کسی انسان نے ہاتھ لگایا ہو گا، نہ کسی جن نے، تو اپنے رب کے کتنے افضال کو جھٹلاؤ گے! ٹیک لگائے بیٹھے ہوں گے سبز چاندنیوں اور خوب صورت قالینوں پر تو تم اپنے رب کی کتنی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے! بڑا ہی بابرکت ہے نام تیرے عظمت والے اور سزاوارِ تکریم رب کا! ۴۶-۷۸

۵۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ ۚ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (۴۶-۴۷)

متقیوں کا انجام

'مجرمین' کے انجام کے بعد یہ متقیوں کا انجام بیان ہو رہا ہے۔ ان کی صفت یہ بیان ہوئی ہے کہ یہ اپنے رب کے حضور پیشی سے برابر ڈرتے رہے۔ اس دن کا حوالہ قرآن کے دوسرے مقام میں 'یَوْمَ یَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ' (المطففین: ۶) کے الفاظ سے آیا ہے، یعنی جس دن لوگ اپنے رب کے حضور میں پیشی کے لیے اٹھیں گے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ انسان کو جادۂ مستقیم پر استوار رکھنے والی واحد چیز یہی اللہ تعالیٰ کے آگے پیشی کا خوف ہے۔ یہ خوف دل سے نکل جائے تو پھر انسان کو بڑے سے بڑا جرم کرنے سے بھی کوئی چیز روک نہیں سکتی۔ فرمایا کہ جو لوگ اپنے رب کے حضور جواب دہی سے ڈرتے رہے ان کے لیے دو باغ ہوں گے۔ قرآن میں لفظ 'جنت' تمام اُخروی کامیابیوں کی ایک جامع تعبیر ہے اور دو جنتوں کا ذکر تکمیلِ نعمت کے طور پر ہوا ہے کہ ایک نہیں بلکہ دو دو جنتیں ان کو ملیں گی۔ سورۂ کہف آیت ۳۲ میں باغ والے کا جو قصہ ہے اس میں بھی دو باغوں کا ذکر ہے: 'جَعَلْنَا لِاَحَدِهِمَا جَنَّتَیْنِ مِنْ اَعْنَابٍ وَّحَفَفْنٰهُمَا بِنَخْلٍ' (الکہف ۳۲) (ان میں سے ایک کو ہم نے دو باغ انگوروں کے دے رکھے تھے اور ان کو گھیر رکھا تھا کھجوروں سے)۔ اس آیت کے تحت ہم نے لکھا ہے کہ یہ دو باغوں کا ذکر اتمامِ نعمت کے اظہار کے لیے

ہے کہ اللہ نے تو اپنے فضل سے اس کو دو دو باغ دے رکھے تھے لیکن یہ نعمت اس کے لیے شکر گزاری کے بجائے ناشکری کا سبب بنی۔

بلاغتِ کلام کا ایک نکتہ

اس کے بعد آیتِ ترجیع ہے اور آگے جنت کی ایک ایک نعمت کے ذکر کے بعد یہ ترجیع آئے گی۔ اس کے موقع و محل کی بلاغت سمجھنے کے لیے یہ بات یاد رکھیے کہ جن مکذبین سے یہاں خطاب ہے وہ اوّل تو قیامت کو بہت بعید از امکان چیز سمجھتے تھے اور اگر ایک مفروضہ کے درجے میں اس کو مانتے بھی تھے تو یہ ماننے کے لیے وہ کسی قیمت پر بھی تیار نہیں تھے کہ آخرت کی نعمتوں میں کوئی حصّہ ان فقیر مسلمانوں کا بھی ہوگا۔ ان کا خیال یہ تھا کہ اگر جنت کی فی الواقع کوئی حقیقت ہے تو جس طرح اس دنیا کی تمام نعمتیں ان کو ملی ہیں اسی طرح آخرت کی نعمتیں بھی انہی کو ملیں گی۔ ان کی اس ذہنیت کو اچھی طرح کچلنے اور ان کے غرور کو بالکل پامال کر دینے کے لیے یہاں جنت کی ایک ایک نعمت پر ہاتھ رکھ رکھ کے فرمایا ہے کہ یہ ہم اپنے متقی بندوں کو دیں گے اور ساتھ ہی ان مکذبین سے سوال کیا ہے کہ بتاؤ تم ہماری کتنی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے! یہاں تو تم کہتے ہو کہ یہ محض جی کو خوش کرنے کی باتیں ہیں لیکن اس وقت کس طرح تکذیب کرو گے جب ہم یہ ساری چیزیں اپنے بندوں کو دیں گے اور تم اس وقت حسرت سے اپنے سر پیٹو گے۔

ذَوَاتَآ اَفْنَانٍ ۝ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ (۴۸-۴۹)

یہ ان دو باغوں کی زرخیزی، شادابی اور برگ و بار کی کثرت کی تعبیر ہے کہ وہ اجاڑ اور بے رونق نہیں ہوں گے بلکہ ایک ایک درخت شاخوں اور ٹہنیوں کی کثرت سے رشکِ چمن ہوگا۔ باغوں کی اس صفت کے بعد بھی آیتِ ترجیع ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ عرب کے امراء و اغنیاء کا سب سے بڑا سرمایۂ ناز باغ ہی ہوتے تھے، اور ایک گرم و خشک ملک میں کسی کے پاس اگر سرسبز و شاداب باغ ہوں تو اس کی خوش بختی و بلند اقبالی کے کیا کہنے ہیں! ان کے اسی ذوق کو سامنے رکھ کر فرمایا کہ ہم اس طرح کے باغ اپنے نیک بندوں کو دیں گے تو تم ہماری کن کن بخششوں کو جھٹلاؤ گے۔

فِیْهِمَا عَیْنٰنِ تَجْرِیٰنِ ۝ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ (۵۰-۵۱)

اس کی شادابی و زرخیزی کی ضمانت کے لیے ان میں الگ الگ دو چشمے بھی رواں دواں ہوں گے۔ تو بتاؤ اپنے رب کی کتنی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے! اس کے بعد آیتِ ترجیع ہے اور اس کا موقع و محل بالکل واضح ہے۔

فِیْهِمَا مِنْ كُلِّ فَاكِهَةٍ زَوْجٰنِ ۝ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ (۵۲-۵۳)

یعنی دونوں باغوں میں ایک ہی قسم کے پھل نہیں ہوں گے بلکہ دونوں میں الگ الگ قسموں کے پھل ہوں گے۔ لفظ 'زوج' یہاں ایک خاص مفہوم میں استعمال ہوا ہے جس کی وضاحت اس کے محل میں ہم کر چکے ہیں۔ اس کے بعد آیتِ ترجیع ہے جس کا موقع و محل بالکل واضح ہے۔

مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰى فُرُشٍۭ بَطَآىِٕنُهَا مِنْ اِسْتَبْرَقٍ ؕ وَجَنَا الْجَنَّتَیْنِ دَانٍ ۚ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ (۵۴-۵۵)

یعنی یہ اہل جنت گاؤ تکیوں سے ٹیک لگائے ایسے تختوں پر بیٹھے ہوں گے جن پر بچھے ہوئے فرشوں کے استر استبرق کے ہوں گے۔ مطلب یہ ہے کہ جن بچھونوں کے استر استبرق کے ہوں ان کے ابرے کا اندازہ کون کر سکتا ہے! مزید یہ کہ دونوں باغوں کے اندر پھلوں کا حال یہ ہو گا کہ وہ سروں پر لٹک رہے ہوں گے۔ ان کے حاصل کرنے میں کسی کو کوئی زحمت نہیں اٹھانی پڑے گی۔ اس کے بعد آیت ترجیع ہے اور اس کا موقع و محل بالکل واضح ہے۔

فِیْهِنَّ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ ۙ لَمْ یَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَآنٌّ ۚ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۚ كَاَنَّهُنَّ الْیَاقُوْتُ وَالْمَرْجَانُ ۚ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ (۵۶-۵۹)

'فِیْهِنَّ' میں ضمیر جمع کا مرجع وہ تمام نعمتیں بھی ہیں جن کا اوپر ذکر ہوا ہے اور جنت کے وہ تمام لان، چمن اور محل بھی جو لفظوں میں مذکور نہ سہی لیکن لوازم کی حیثیت سے وہ بدیہی طور پر سمجھے جاتے ہیں۔ عربی میں اس طرح ضمیروں کا استعمال معروف ہے۔ اس کی مثالیں اس کتاب میں پیچھے گزر چکی ہیں۔ فرمایا کہ عیش دوام کے ان باغوں اور سامانوں کے اندر ان کے لیے شرمیلی اور باحیا نازنینیں بھی ہوں گی۔ انسان کی فطرت کچھ ایسی بنی ہوئی ہے کہ وہ ان چیزوں سے اس وقت تک اچھی طرح لطف اندوز نہیں ہو سکتا جب تک بیوی اس کے ساتھ نہ ہو جس کو قدرت نے اس کا شریک رنج و راحت بنایا ہے۔ چنانچہ تعریف میں فرمایا ہے کہ وہ نہایت شرمیلی اور باحیا ہوں گی۔ عورت کا یہ شرمیلا پن اس کا سب سے بڑا حسن بھی ہے اور اس کے اخلاق کا سب سے بڑا محافظ بھی۔ جو عورت شرمیلی نہیں ہے وہ ہرجائی ہے۔ ہرجائی کسی کی وفادار نہیں ہو سکتی اور جب وہ وفادار نہیں ہو سکتی تو ایک عورت کی حیثیت سے اس کا وجود بے مقصد ہے اس لیے کہ وہ کسی خاندان کی تعمیر میں بنیاد کی اینٹ کا کام نہیں دے سکتی درآنحالیکہ یہی عورت کے وجود کی غایت ہے۔

'لَمْ یَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَآنٌّ'۔ یہ ان کے شوہر ناآشنا ہونے اور کنوارپن کی تعبیر ہے۔

'یاقوت' اور 'مرجان' سے ان کی تشبیہ ان کے حسن اور ان کی عصمت و محفوظیت کے بیان کے لیے ہے۔

ان صفتوں کے بعد بھی ترجیع والی آیت آئی ہے اور اس کا موقع و محل بالکل واضح ہے۔

هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ ۚ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ (۶۰-۶۱)

جزا و سزا کے حق میں عقل و فطرت کا گواہی

مقربین کی جنت کے اوصاف بیان کرنے کے بعد یہ آخر میں مخاطبوں کو متوجہ کر کے نہایت بلیغ بات ارشاد فرمائی ہے کہ اس بات پر تمہیں تعجب کیوں ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کو یہ ساری نعمتیں دینے والا ہے! آخر نیکی اور پاکبازی کا بدلہ کیا ہونا چاہیے، فضل و کرم ہی ہونا چاہیے یا کچھ اور؟ اگر اس کائنات کا خالق ایک ایسا دن نہ لائے جس میں بروں کو ان کی بدیوں کی سزا اور نیکوں کو ان کی نیکیوں کا بھرپور صلہ دے تو اس

کے معنی یہ ہوئے کہ اس کو نیکی اور بدی میں کوئی امتیاز ہی نہیں ہے بلکہ اس سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ نعوذ باللہ وہ بدی کو زیادہ پسند کرتا ہے کہ اس نے شریروں کو سارے وسائل دے کر اس دنیا میں آزاد چھوڑ رکھا ہے کہ وہ اس میں جو اودھم چاہیں مچائیں۔ انسان کی عقل اور اس کی فطرت اپنے رب کے متعلق اس قسم کی مکروہ بدگمانی کبھی گوارا نہیں کرسکتی۔ اس کی فطرت کی شہادت یہی ہے کہ کائنات کا خالق نہایت ہی عادل اور رحیم ہے۔ وہ ان لوگوں کو سزا دے گا جو برائیوں کے مرتکب ہوں گے اور نیکوں کو ان کی ایک ایک نیکی کا بھرپور صلہ دے گا۔ یہ بات چونکہ انسانی فطرت میں راسخ ہے، کوئی عاقل، سلامتیٔ عقل و ہوش کے ساتھ، اس کا انکار نہیں کرسکتا اس وجہ سے بات ایسے اسلوب میں فرمائی ہے جو ایک واضح حقیقت کے بیان کا ہے۔ لفظ 'احسان'، نیکی کے معنی میں بھی آتا ہے اور نیک صلہ کے معنی میں بھی۔ اس آیت میں یہ نہایت خوبصورتی کے ساتھ دونوں ہی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

اس کے بعد آیتِ ترجیع ہے اور اس کا موقع بیان یہ ہے کہ جب یہ حقیقت اپنی جگہ ثابت اور مسلّم ہے تو اللہ تعالیٰ لازماً ہر نیکی کا نیک صلہ دے کے رہے گا، تم اس کے کن کن انعامات کو جھٹلاؤ گے!

وَمِنۡ دُوۡنِہِمَا جَنَّتٰنِ ۚ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (۶۲-۶۳)

اصحاب الیمین کی جنت

مذکورہ دو جنتوں کے سوا اب دو اور جنتوں کا ذکر آ رہا ہے جو اپنی خصوصیات کے اعتبار سے مذکورہ جنتوں کے ساتھ فی الجملہ اشتراک بھی رکھتی ہیں اور بعض اعتبارات سے ان سے مختلف بھی ہیں۔ ان کے متعلق یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان دونوں قسم کی جنتوں کے حق دار ایک ہی قسم کے لوگ ہوں گے یا الگ الگ قسم کے لوگ۔ اس کا صحیح جواب آگے آنے والی سورہ ـــــــ سورۂ واقعہ ـــــــ میں آئے گا۔ اس میں اہلِ ایمان کو دو گروہوں میں تقسیم فرمایا ہے: 'اصحب المیمنۃ' اور 'السابقون' اور ان دونوں کے لیے الگ الگ جنتوں کا ذکر ہے جن کے اوصاف میں فی الجملہ اشتراک بھی ہے اور بعض پہلوؤں سے اختلاف بھی۔ اس وجہ سے قرینِ قیاس بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ اوپر 'سابقین اوّلین' یا بالفاظ دیگر 'مقربین' کی جنت کا ذکر ہے اور اب یہ 'مِنۡ دُوۡنِہِمَا' کی جنت کا ذکر آ رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس طرح دونوں گروہوں کے مرتبہ میں فرق ہے اسی طرح دونوں گروہوں کی جنتوں میں بھی فرق ہے، جس کا اندازہ اہلِ ذوق خود کرسکتے ہیں۔ آگے ہم بھی اس فرق کے بعض پہلوؤں کی طرف اشارہ کریں گے۔ 'مِنۡ دُوۡنِہِمَا' کا ترجمہ 'ان دو کے سوا'، 'ان دونوں کے بالمقابل' بھی ہو سکتا ہے اور 'ان دونوں سے فروتر' بھی۔

اس ٹکڑے کے بعد وہی ترجیع ہے جو ہر نعمت کے ذکر کے ساتھ برابر آ رہی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہو گا کہ انہی دو جنتوں پر تو بس نہیں ہے اور بھی دو جنتیں ہوں گی تو تم کن کن جنتوں کو جھٹلاؤ اور ان کا مذاق اڑاؤ گے!

مُدۡہَآمَّتٰنِ ۚ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (۶۴-۶۵)

یعنی ان کی سرسبزی کا حال یہ ہوگا کہ وہ مائل بہ سیاہی ہو جائے گی۔ شاداب باغ کا سب سے زیادہ خوبصورت رنگ یہی ہوتا ہے۔ اس کے بعد آیتِ ترجیع ہے جس کا موقع و محل بالکل واضح ہے۔

فِيهِمَا عَيْنَانِ نَضَّاخَتَانِ ۚ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ (۶۶ - ۶۷)

'نضخ' کے معنی جوش مارنے اور اُبلنے کے ہیں۔ یہ پہاڑی چشموں کی تصویر ہے۔ میدانی علاقوں کے چشمے تو، جیسا کہ اوپر لفظ 'تَجْرِيَانِ' آیا ہے، صرف بہتے ہیں لیکن پہاڑی چشمے جوش کے ساتھ ابلتے ہیں۔ اس کے بعد آیتِ ترجیع ہے جس کا موقع و محل بالکل واضح ہے۔

فِيهِمَا فَاكِهَةٌ وَنَخْلٌ وَرُمَّانٌ ۚ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ (۶۸ - ۶۹)

'فَاكِهَةٌ' کے بعد 'نَخْلٌ' (کھجور) اور 'رُمَّانٌ' (انار) کا ذکر عام کے بعد خاص کی حیثیت رکھتا ہے اور یہ دونوں میوے عرب کے محبوب میووں میں سے ہیں۔ اوپر کی جنت میں 'مِنْ كُلِّ فَاكِهَةٍ زَوْجَانِ' کے الفاظ آئے ہیں۔ یعنی دونوں باغوں میں ہر پھل کی الگ الگ قسمیں ہوں گی۔ ان دونوں اسلوبوں میں جو فرق ہے وہ نگاہ میں رہے۔ اس کے بعد آیتِ ترجیع ہے اور اس کا موقع و محل بالکل واضح ہے۔

فِيهِنَّ خَيْرَاتٌ حِسَانٌ ۚ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ۚ حُورٌ مَّقْصُورَاتٌ فِي الْخِيَامِ ۚ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ۚ لَمْ يَطْمِثْهُنَّ إِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَانٌّ ۚ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ (۷۰ - ۷۵)

'خَيْرَاتٌ حِسَانٌ' کے معنی ہیں پاکیزہ سیرت اور پاکیزہ صورت۔ 'حُورٌ مَّقْصُورَاتٌ فِي الْخِيَامِ' میں خاص عربی ذوق نمایاں ہے۔ خیموں کی رہائش اہلِ عرب کی پسندیدہ رہائش رہی ہے۔ امرائے عرب کے خیمے اور شامیانے شاندار محلوں کے لیے بھی قابلِ رشک ہوتے تھے اور یہاں تو ذکر جنت کے خیموں کا ہے۔ اوپر کی جنت میں شرمیلی نازنینوں کا ذکر ہے اور ان کو یاقوت و مرجان سے تشبیہ دی گئی ہے۔ دونوں جگہ صفات کا جو فرق ہے وہ نگاہ میں رہے۔ ہر صفت کے بیان کے بعد آیتِ ترجیع بھی آئی ہے اور اس کا موقع و محل واضح ہے۔

مُتَّكِئِينَ عَلَىٰ رَفْرَفٍ خُضْرٍ وَعَبْقَرِيٍّ حِسَانٍ ۚ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ (۷۶ - ۷۷)

یعنی اس قسم کی جنتوں میں سبز چاندنیوں اور خوبصورت نادر قالینوں پر گاؤ تکیوں سے ٹیک لگائے ہوئے وہ بیٹھے ہوں گے۔ لفظ 'عبقری' نادر اور قیمتی چیزوں کے لیے آتا ہے اور موقع و محل کی رعایت سے اس کا اطلاق مختلف چیزوں پر ہو سکتا ہے۔ ہم نے محض موقع کی مناسبت سے یہاں اس کو نادر قالینوں کے معنی میں لیا ہے۔ اس کے بعد آیتِ ترجیع ہے اور اس کا موقع و محل بالکل واضح ہے۔

تَبَارَكَ اسْمُ رَبِّكَ ذِي الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ (۷۸)

خاتمۂ سورہ

جس طرح اوپر جزاء و سزا کے دلائل بیان کرنے کے بعد فرمایا ہے کہ 'كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۝ وَيَبْقَىٰ

وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ، اسی طرح جزاء وسزا کی تفصیلات سنانے کے بعد اسی آیت کا اعادہ فرمایا ہے اور مقصود اس اعادے سے یہ ظاہر کرنا ہے کہ چونکہ تیرے رب ذوالجلال والاکرام کی ذات بڑی ہی خیر و برکت والی ہے اس وجہ سے اس کی یہ تمام برکتیں لازماً ظاہر ہوں گی۔ نادان ہیں وہ لوگ جو سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا پیدا تو کر دی لیکن پیدا کر دینے کے بعد اس کے خیر و شر سے اسے کوئی تعلق باقی نہیں رہا۔ جس طرح اوپر والی آیت میں لفظ 'وجہ' سے اللہ تعالیٰ کی ذات کو تعبیر فرمایا ہے اسی طرح اس آیت میں لفظ 'اسم' سے اس کی ذات کو تعبیر فرمایا ہے۔ اسم اپنے مسمّٰی پر دلیل ہوتا ہے۔

مذکورہ جنتوں کے اوصاف پر غور کیجیے تو ایک بات واضح طور پر محسوس ہوتی ہے کہ اوپر کی جنتوں میں جو نعمتیں بیان ہوئی ہیں ان میں اہلِ عجم کا ذوق زیادہ نمایاں ہے اور بعد کی جنتوں میں اہلِ عرب کا ذوق زیادہ اُبھرا ہوا نظر آتا ہے۔ اگرچہ یہ نعمتیں بطور تشبیہ بیان ہوئی ہیں، ان کی اصل حقیقت کا علم صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہے تاہم ان کی مدد سے کسی حد تک یہ ہمارے تصور کے قریب آجاتی ہیں اور یہی ان تشبیہات سے مقصود ہے۔

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ آج ۲۴۔رمضان المبارک ۱۳۹۷ھ کو ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی اِحْسَانِہٖ۔

لاہور

۱۰۔ستمبر ۱۹۷۷ء

۲۴۔رمضان المبارک ۱۳۹۷ھ